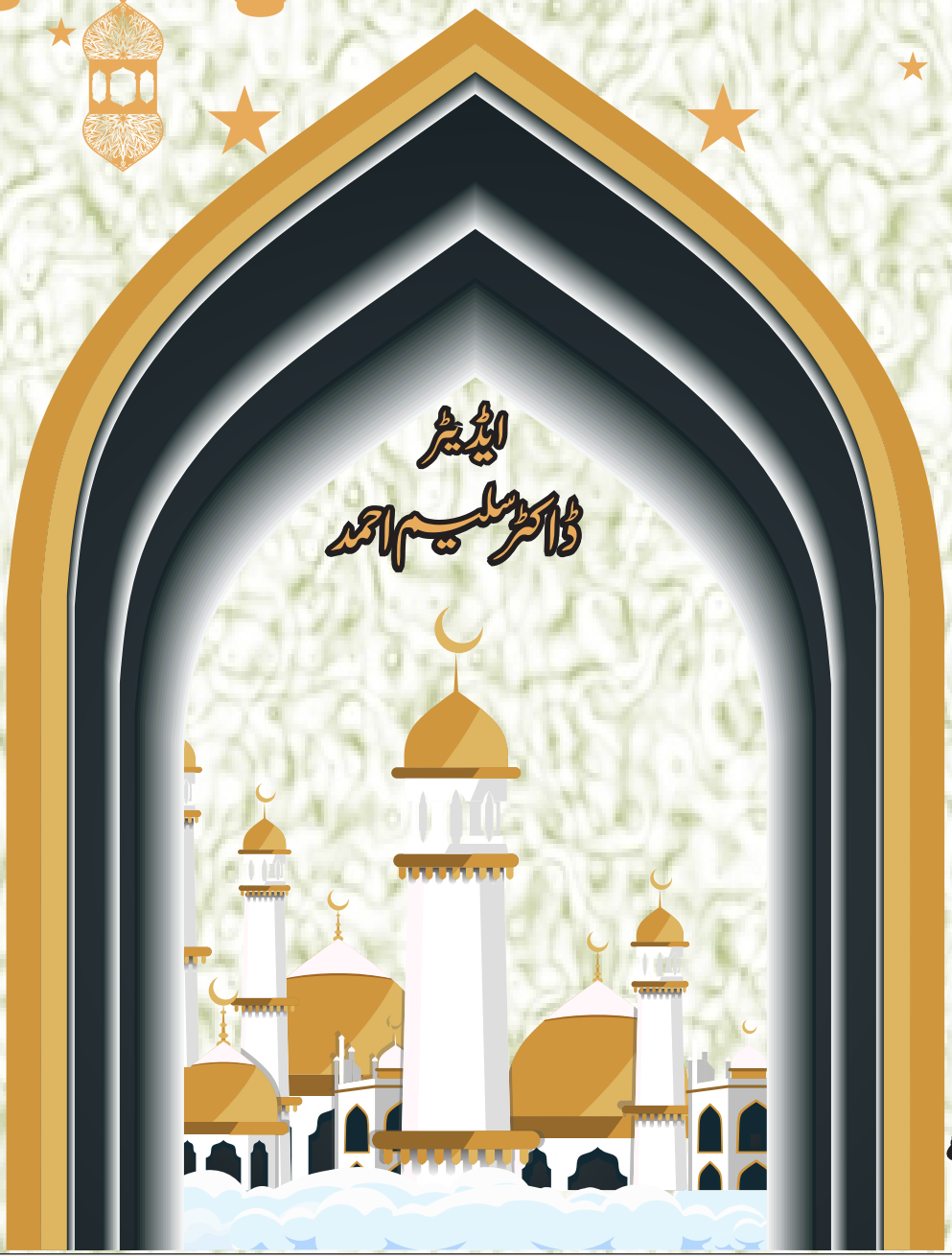
ISSN: 2581-5482

سہ ماہی

ادبی نشیمن لکھنؤ

مارچ تا مئی ۲۰۲۳ء

ADBEE NASHEMAN



ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

قیمت ۲۵/روپے

ملک کے عوام وخواص کو

رمضان المبارک

اور عید الفطر کی

ادبی نشیمن

کنبہ کی جانب سے

دلی مبارک باد

مارچ تا مئی ۲۰۲۳ء
ISSN: 2581-5482
جلد : ۶ شمارہ: ۲

سہ ماہی

ادبی نشیمن

سرپرست
ڈاکٹر عامر قدوائی (کویت)
ڈاکٹر وسیم احمد صدیقی (آسٹریلیا)

ایڈیٹر
ڈاکٹر سلیم احمد
Mob: 8707260591, 9415693119
saleemahmad110@gmail.com
adbeenasheman@gmail.com

معاون ایڈیٹر
شاہد حبیب
Mob: 8539054888
shahidhabib10@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر غلام حسین (اجین) — ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
ڈاکٹر مجاہد الاسلام (لکھنؤ) — ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی
ڈاکٹر شکیل احمد (مئو) — وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)
محمد حنظلہ ندوی (لکھنؤ)

☆ ادبی نشیمن کو RNI سے رجسٹریشن سرٹیفکیٹ Adbee Nasheman کی اسپیلنگ کے ساتھ ملا ہے۔ اس لیے غلط ہونے کے باوجود مجبوراً یہی اسپیلنگ ہر جگہ استعمال کی جا رہی ہے۔

☆ ادبی نشیمن میں شائع ہونے والے خیالات قلمکاروں کے اپنے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی کا اختیار صرف لکھنؤ کی عدالتوں کو حاصل ہے۔

ADBEE NASHEMAN

قیمت

فی شمارہ	:	۲۵/روپے
دوسالہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک	:	۳۰۰/روپے
بیرونی ممالک (ہوائی جہاز ڈاک)	:	25 $ (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبرشپ	:	پانچ ہزار روپے
لائبریری/ادارہ کے لئے	:	۶۵/روپے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ
سہ ماہی ادبی نشیمن
168/C-544 الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Indian Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No : 50489096237
IFSC : IDIB000L558

Address

Editor Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
544-C/168,Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

www.adbeenasheman.com
E-mail: adbeenasheman@gmail.com

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج لکھنؤ سے چھپوا کر e-168/544، الماس باغ ہردوئی روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست سہ ماہی ادبی نشیمن، لکھنؤ مارچ تا مئی ۲۰۲۳

آغاز

حمد ..... پیکر سعادت معز ۳
نعت پاک ..... حبیب راحت حبابؔ ۳

اداریہ

نظریہ ..... ڈاکٹر سلیم احمد ۴

مضامین

۱ برہان پور کے پانچ شاعر: امکانات اور مسائل ..... ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی ۵
۲ جیلانی بانو: بحیثیت افسانہ نگار ..... ڈاکٹر نارائن پاٹیدار ۹
۳ گورکھپور میں پہلی جنگ آزادی کے نقوش ..... ڈاکٹر درخشاں تاجور ۱۵
۴ مزاحیہ شاعری کا باوقار شاعر- ساغرؔ خیامی ..... ڈاکٹر نزہت زہرا ۱۸
۵ امانت اللہ اسیر کی شاعری کے فنی رموز و نکات ..... ڈاکٹر محمد الیاس قاسمی تائب خیرآبادی ۲۲
۶ معنی و مفہوم کے انوار سے روشن جزیرہ ..... مراق مرزا ۲۶
۷ ''دیکھ لی دنیا ہم نے'': سینکڑوں صفحات میں بکھری غضنفر کی ایک مختصر دنیا ..... ڈاکٹر شکیل احمد ۲۸
۸ خاکہ نگاری شخصیت کے آئینہ میں ..... شبیر احمد ملک ۳۱

انٹرویو

۹ مشہور نقاد شاعر اور ادیب پروفیسر علیم اللہ حالی سے خالد عبادی کی گفتگو ..... مصاحبہ کار: خالد عبادی ۳۴

غزلیات

۱۰ غزلیں ..... ڈاکٹر اختر ریاض / عامر قدوائی ۳۸
۱۱ غزلیں ..... شعیب ندیم/ مرغوب اثر ۳۹
۱۲ غزلیں ..... ظفر صدیقی/ صائمہ ثمرین ۴۰
۱۳ نظمیں ..... فریدہ انجم/ یاسمین حسین زیدی نکہت ۴۱
۱۴ نظم ..... مشتاق صدف ۴۲
۱۵ قطعات ..... مصداق اعظمی ۴۳

انشائیہ

۱۶ اردو ..... صدف جمال ۴۴

افسانچہ

۱۷ کل ہماری باری ہے ..... ڈاکٹر سلیم احمد ۴۵

سفرنامہ

۱۸ 'بالاسور' یاترا ..... ڈاکٹر مجاہد الاسلام ۴۶

افسانے

۱۹ قربانی ..... نور شاہ ۵۲
۲۰ شہر تمنّا کی آرزُو ..... نصیر رمضان ۵۳
۲۱ الاؤ ..... تنویر اختر رومانی ۵۷
۲۲ یورآنر ..... شاہد حبیب ۵۸

تبصرے

۲۳ کھول دو (افسانچوں کا مجموعہ) ..... تنویر احمد رومانی/ مبصر: ڈاکٹر سلیم احمد ۵۹
۲۴ متن کے آس پاس ..... سلمان عبدالصمد/ مبصر: پروفیسر غضنفر علی ۶۰
۲۵ رنگ رنگ کے شاعر ..... ساجد جلال پوری/ مبصر: ڈاکٹر سلیم احمد ۶۱
۲۶ اعتبار حرف ..... منظور پروانہ/ مبصرہ: ڈاکٹر قدسیہ ۶۲
۲۷ عروس لفظ کا مسکن لکھنؤ ..... رضوان فاروقی/ مبصر: ڈاکٹر رضوان انصاری ۶۳

مراسلات ..... قارئین ۶۴

حمد باری

تخلیق کن فکاں ہے عالم تمام تیرا
تو مالک حقیقی ہر اک غلام تیرا

ہر شئے کے ساتھ تیری عمدہ صفت نمایاں
تو کارساز عالم سارا نظام تیرا

بے مانگے مل رہا ہے ہر اک کو رزق اس کا
جو دوسرا کرم ہے سب پر دوام تیرا

وہ مصطفٰے محمد وہ رحمت دو عالم
ہے امتی پہ ان کے فیضان عام تیرا

میں کیا میری حقیقت میں پیکر گناہی
''اسفل مقام میرا، اعلی مقام تیرا''

☆☆☆

پیکر سعادت معز
ہنمکنڈہ، موبائل:9515146730

نعت

اب پھر لے کے چلا مجھ کو وجدان مدینے میں
پھر ہوگی ہر اک مشکل آسان مدینے میں

دوری میں بھی رہتا ہوں سرشار حضوری سے
ہے جسم تو کھنڈوا میں، اور جان مدینے میں

کرتے رہیں ہم پیہم ،کرتے رہیں ہم پیہم
دن رات درودوں کی گردان مدینے میں

سب چھوڑ چُھڑا کر چل ، چل تُجھ کو ملے گا چل
تسکینِ دل و جاں کا سامان مدینے میں

کُنبہ بھی مرا آئے ہمراہ مرے آقاؐ
پورے ہوں سبھی دل کے ارمان مدینے میں

اِک بار ہی نظّارہ مل جائے نگاہوں کو
جاتی ہے چلی جائے پھر جان مدینے میں

اللہ نے چاہا تو لکّھیں گے حبابؔ
ہم بھی اِک نعتِ محمّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیوان مدینے میں

☆☆☆

حبیب راحت حبابؔ
موبائل:9977766628

نظریہ



معروف ناقد و فکشن نگار پروفیسر انیس اشفاق کی گراں قدر خدمات سے برصغیر کے ادبی قارئین خوب واقف ہیں۔ انیس اشفاق ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے اردو ادب کی جس صنف پر جب چاہا لکھا اور خوب لکھا۔ محقق، نقاد، افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر، ترجمہ نگار کے علاوہ سفر نامہ اور رپورتاژ بھی لکھے۔ ان کے ناولوں یا افسانوں میں لکھنوی تہذیب و تمدن کی عکاسی کسی نہ کسی صورت میں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ ان کا ایک ناولٹ ہے ''دکھیارے''۔ اس ناولٹ کو پڑھتے وقت لکھنؤ کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف خود اپنی آپ بیتی بیان کر رہا ہے۔ ایسا ہی ان کا ایک اور ناول ہے ''خواب سراب'' جو امراؤ جان ادا کی ری ڈسکوری ہے۔ اس ناول میں بھی لکھنؤ کی گلیاں، حویلیاں، چوک، چاول والی گلی، کوچہ میر انیس، اکبری گیٹ، لکھنوی محاورے اور قدیم لکھنؤ کی بود و باش غرض لکھنؤ کا ہر خاصہ ناول میں موجود ہے۔ اسی ناول پر ساہتیہ اکادمی نے سال ۲۰۲۲ کا ایوارڈ پروفیسر انیس اشفاق کو دینے کا اعلان کیا ہے۔ اسی کے ساتھ معروف افسانہ نگار اور ترجمہ نگار محترمہ رینو بہل کو ترجمے کا ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ محترمہ رینو بہل نے مادھو کوشک کا شعری مجموعہ ''سنورادھیکا'' کا ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ دونوں ہی شخصیتوں کی خدمت میں ادارہ ادبی نشیمن ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی کا یہ قدم قابل صد ستائش ہے کہ سال ۲۰۱۹ اور ۲۰۲۱ کے رکے ہوئے ایوارڈ اور انعامات کا اعلان کیا گیا اور پانچ لاکھ روپئے پر مشتمل مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ پروفیسر عبدالحق (دہلی) اور پروفیسر عتیق اللہ (دہلی) مرحمت ہوا۔ اس کے علاوہ چھوٹے بڑے تقریباً ۱۲۵ قلمکاروں کو تقریباً ۸۶ لاکھ روپئے کے ایوارڈز اور انعامات سے نوازنے کا قابل تعریف کام انجام دیا گیا۔ اس تعلق سے ادبی حلقوں میں طرح طرح کی چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں مگر ان سب کو غلط ثابت کرتے ہوئے چیئرمین چودھری کیف الوریٰ نے اردو والوں میں مثبت پیغام پیش کیا ہے۔ ادارہ ادبی نشیمن سبھی ایوارڈ یافتگان کو سلام اور ہدیہ تبریک پیش کرتا ہے۔

معروف اور بے باک فکشن نگار شموئل احمد طویل علالت کے بعد ۷۷ برس کی عمر میں دار فانی سے کوچ کر گئے۔ بنیادی طور سے انجینئر رہے شموئل احمد اپنے انداز کے منفرد اور بے خوف افسانہ نگار تھے۔ وہ جو لکھنا چاہتے تھے، کسی کی پرواہ کیے بغیر لکھتے۔ ان کے پانچ ناول اور چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ ان کا افسانہ 'سنگھار دان' اور ناول 'گرداب' قارئین کی نظر میں کافی مقبول ہوا۔ وہ اپنی بے باکی اور برجستگی کی وجہ سے عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کی طرح اکثر متنازعہ رہے۔ ''لنگی'' اور ''پروفیسر کا حرم'' ان کا ایسا ہی افسانہ ہے جو پروفیسران کے ذریعہ ریسرچ کرنے والے طلبہ کے ذہنی و جنسی استحصال کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے اردو فکشن کو وسعت بخشی اور اس کے دامن میں بیش بہا اضافہ بھی کیا۔ وہ اپنے منفرد اسلوب، تیکھے لب ولہجہ، اچھوتے موضوعات اور بے باکی کی وجہ سے فکشن نگاری کی دنیا میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب ہی انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز بناتا ہے۔ ان کے اسلوب نگارش کا ہی کمال ہے کہ وہ سماجی و معاشرتی مسائل کو جب افسانے یا ناول کے قالب میں ڈھالتے ہیں تو کہیں نہ کہیں سے جنس کی جھلک چھوڑ جاتے ہیں، یہی ان کی انفرادیت اور شناخت کا مستحکم حوالہ ہے۔ ادب میں شموئل احمد کی مقبولیت ان کے افسانو اور ناولوں کی وجہ سے ضرور ہوئی مگر انھوں نے ہندی میں بھی جو کہانیاں لکھیں وہ بھی مقبول ہوئیں۔ وہ ایک اچھے کالم نگار، مترجم اور ماہر علم نجوم کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ علم نجوم پر ان کی دسترس کا نتیجہ تھا کہ عنکبوت، القمبوس کی گردن، مصری کی ڈلی اور بہرام کا گھر جیسے افسانے ان کے قلم سے وجود میں آئے۔ ادارہ ادبی نشیمن ان کی بلندی درجات کے لیے دعا گو ہے۔

اسی درمیان ۱۰ رفروری کو معروف شاعر اور ڈرامہ نگار امجد اسلام امجد، ۱۱ رفروری کو محقق اور خاکہ نگار پروفیسر ابن کنول، ۱۳ رفروری کو مکالمہ نگار، ہدایت کار اور آواز کے جادوگر ضیاء محی الدین اور ۱۴ رفروری کو ادب شناش اور بین العلومی شخصیت پروفیسر محمد مزمل یکے بعد دیگرے فانی دنیا کو الوداع کہہ گئے۔ ان ماہ و نجوم کی وفات یقیناً اردو کا اور معاشرے کا بڑا خسارہ ہے مگر ہمیں یقین ہے کہ ان کی تحریریں ہمیشہ ان کو زندہ رکھیں گی۔ ادبی نشیمن پریوار سبھی مرحومین کو جذباتی خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور ان کے غریق رحمت ہونے کی دعا کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم احمد

مارچ ءتا مئی ۲۰۲۳ء

برہان پور کے پانچ شاعر: امکانات اور مسائل

ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی (برہان پور)
صدر شعبۂ اردو، جگ جیون کالج آرہ، بہار (موبائل: 8770786313)

کسی بھی متمدن معاشرے کی علمی و ادبی تاریخ اس کے تہذیبی و ثقافتی رشتے، مذہبی رواداری، سیاسی و معاشرتی پس منظری روداد اور اکابرین کے کارناموں کی بازیافت اور گونج جو معاصر عہد میں سنائی دیتی ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس معاشرے، شہر یا علاقے کا ماضی کس قدر تابناک اور معیار و وقار کے اعتبار سے لائق ستائش اور لائق تقلید ہے۔ برہان پور اپنے ماضی کی روداد اور تاریخ کے روشن حوالوں کی بدولت علمی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ اس زرخیز سرزمین پر ہر عہد میں علمی، ادبی، سیاسی، سماجی شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں۔ جنھوں نے اپنی خدمات سے پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔ آج ہم جس عہد میں جی رہے ہیں اس میں پوری دنیا ایک نقطہ میں سمٹ آئی ہے۔ عام طور پر لوگوں کے اذہان چھوٹے ہوتے جارہے ہیں اور دل تنگ، یہ کوئی شکوہ گذاری نہیں بلکہ انسانی روّیوں کے زیرِ اثر پیدا ہونے والا وہ تاثر ہے جس نے فکری اور جذباتی سطحوں پر ہمارے اندرون کو درہم برہم کر دیا۔

تحریری و علمی طور پر برہان پور کے اہلِ علم بخیل ثابت ہوئے ہیں۔ علمی و ادبی لحاظ سے کوئی پرنٹ میڈیا یا علمی و ادبی ادارہ ایسا نہیں ہے جو نہ صرف علم و ادب کے بیرونی معاملات کو مشتہر کرے بلکہ جس کی بدولت خود سرزمینِ برہان پور کے علمی و ادبی وقار کا اندازہ دیگر شہروں کی عوام اور پڑھا لکھا طبقہ کر سکے۔ ادھر کچھ عرصہ قبل لطیف شاہدؔ اور تنویر رضا برکاتی نے دارالسرور کے عنوان سے جو سہ ماہی رسالہ جاری کیا تھا اس کے مشمولات اور مدیر کی ذاتی اور مجموعی ترجیحات کے پیشِ نظر اس سے کوئی قابلِ قدر توقع وابستہ کی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ امتدادِ زمانہ نے سستی شہرت اور شاعرانہ کرتب بازی کے اظہار کو وقتی اہمیت دے دی ہے۔ آج اپنے شب و روز پر سنجیدہ فکر کا اظہار کرنے کی صلاحیت سے ہم محروم ہوتے جارہے ہیں۔ محض مشاعرہ پڑھ کر اور چند ناخواندہ اور وقت گذاری کے لئے تفریح کرنے والے لوگوں کی داد و تحسین نے شاعروں کو وقتی اور ہنگامی چیزوں کی تخلیق تک محدود کر دیا ہے اور یہ کہ مشاعرہ پڑھنا ہی اچھی شاعری اور اچھا شاعر ہونے کی علامت بن چکا ہے۔ وگرنہ سچائی تو یہ ہے کہ ایسے لوگ دو منٹ ادب و شاعری پر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کے بھی اہل نہیں ہیں۔

مشاعرہ بازی اور شاعرانہ کرتب بازی کی اس افراط و تفریط میں بعض ایسے سنجیدہ لکھنے والے موجود ہیں جو اس ہنگامے سے دور اپنی تخلیقی اور فکری کائنات میں ہمہ وقت مسرور و سرشار رہتے ہیں۔ کچھ حالات کی ستم ظرفی اور کچھ طبیعت کی اداسی یا شرمیلے پن نے انھیں عام قاری یا سامع تک پہنچنے سے مانع رکھا۔ لیکن وقت ایسے سنجیدہ لکھنے والوں کو فراموش نہیں کرتا اور ان کی قدردانی کے راستے ہموار بھی کرتا ہے۔ میں برہان پور میں ایسے کئی فنکاروں کو جانتا ہوں جنھیں متعارف کرانا اور سنجیدہ قارئین تک ان کا کلام پہنچانا اپنا ادبی فرض سمجھتا ہوں۔ اسی سلسلے کی کڑی کے طور پر یہ مضمون قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

برہان پور کے کہنہ مشق شاعروں میں جو نسل اپنا کام تقریباً مکمل کر چکی ہے ان میں سرِ فہرست مرحوم کلام آذرؔ، تسنیم انصاری، مجاز آشناؔ، جمیل اصغر، لطیف شاہدؔ، شاد شفقی، نعیمؔ خادمی، نعیم نیازؔ وغیرہ شامل ہیں۔ ان شعراء کے بعد جس نسل نے باگ دوڑ سنبھالی ہے ان میں بعض لوگوں نے خوش فہمی اور بقراطی کو اپنا وطیرہ بنا رکھا ہے۔ چند بیرونی مشاعروں میں شرکت اور چند ناخواندہ اور غیر ادبی لوگوں کے گروہ کی بدولت خود کو بڑا شاعر یا کم از کم اہم شاعر سمجھنے کی وجہ سے ناخود اچھی شاعری کر رہے ہیں اور نہ ہی کسی اچھے شعری و ادبی کام یا کارنامے کی توقع ان سے کی جاسکتی ہے۔ بہرحال یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہمارے مضمون کا مقصد رفی الحال سرزمین برہان پور سے اٹھنے والی اچھی آوازوں کو متعارف کرانا ہے جو پوری دیانت داری کے ساتھ شاعری و ادب سے اپنا رشتہ استوار کئے ہوئے ہیں۔ یہ وہ خوش نصیب شاعر ہیں جنھیں بالکل سطحی عوام (جو عموماً مشاعروں میں ملتی ہیں) سے زیادہ واسطہ نہیں پڑا ہے۔

توحید کاملؔ برہان پور کے کہنہ مشق شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ مگر زندگی نے انھیں ادب و شاعری کے لئے مہلت نہیں دی اور یہ خالص فنکار تقاضائے زندگی کے سامنے شب و روز کے حالات کی چکّی میں پستا رہا۔ قدرت نے ذہن میں ندرت اور خلاقی کا جوہر انفرادی انداز کا رکھا تھا۔ لہٰذا وقتاً فوقتاً

غزل کہتے رہتے تھے۔ مشاعروں ادبی نشستوں سے احتراز بھی کرتے تھے۔ توحید کاملؔ کی غزل پڑھ کر عجیب وغریب کیفیات اور منفرد انداز و بیان کے کلام سے متعارف ہوتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ادبی سیاست سے اتنے فاصلے پر رہنے والا شاعر کس قدر مختلف فکر کا مالک ہے ان کا شعر ہے ؎

چند صفحات پہ ہم لوگ گذر کرتے ہیں
آپ اخبار و رسائل کا سفر کرتے ہیں

قناعت اور بردباری کا یہ اظہار دراصل ان کی زندگی اور خلوت نشینی کا استعارہ بھی ہے۔ یہاں توحید کاملؔ کے مختلف اشعار ہم نذرِ قارئین کرتے ہیں۔ جس میں زندگی اور انسان کی بلند حوصلگی کی عمدہ مثالیں موجود ہیں ؎

جگنو کہیں سے آ گئے چھپّر کے آس پاس
کل رات روشنی تھی مرے گھر کے آس پاس
سورج کی ساری دھوپ امیروں نے بانٹ لی
اونچی عمارتیں تھیں مرے گھر کے آس پاس
ٹوٹے ہوئے مکان پہ دستک تو دے کوئی
سرمایۂ حیات ابھی میرے پاس ہے

پہلا شعر شاعر کے حالات اور تاثرات کی تجسیم کی بدولت بہت ہی خوبصورت انداز میں سامنے آتا ہے۔ جگنو کی روشنی، امید اور خوشی کا استعارہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرا شعر طنز اور تمسخر کی مثال بن جاتا ہے۔ یہاں شاعر اپنے حالات بیان کرنے کے بجائے علّت و معلول کا رشتہ قائم کر دیتا ہے۔ غزلیہ شاعری میں بالخصوص اس طریقۂ اظہار کا استعمال کوئی آسان کام نہیں ہے۔ سورج کی دھوپ کی عدم دستیابی اسے اداس یا شکوہ گذار بناتی بلکہ اس کا بیان آس پاس موجود اونچی عمارتوں کے ذریعہ معاشرتی تفریق اور اس سے پیدا شدہ طنز Irony کو سامنے لاتا ہے۔ شاعر کو یہ بھی پتہ ہے کہ اس کی خستہ حالی میں کوئی اس کا شریک نہیں مگر پھر بھی زندگی یا سرمایۂ حیات کو سنبھالے ہوئے اس میں زندگی کرنے کا حوصلہ یا لگن موجود ہے۔ چند شعر مختلف رنگوں کے اور ملاحظہ کریں جن میں توحید کاملؔ اپنی شاعرانہ آب وتاب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

احتیاط سے چلنا کانچ کی زمینوں پر
پھول بھی برستے ہیں سنگ بھی برستے ہیں
صحرا کی طرح ہے مری خاموش مزاجی
اور مجھ سا کوئی بولنے والا بھی نہیں ہے
بڑھ رہا ہوں میں موت کی جانب
چند روزہ حیات کو لے کر
دنیا کی سماعت پر بھرپور طمانچہ ہے
اخبار کی سرخی سے لپٹی ہے صدا میری
گھر سے جب نکلو تو دستار پہن کر نکلو
یہ عمل صاحبِ کردار بنا دیتا ہے
لفظوں سے کھیلنے کا ہنر ہے کمال کا
پہنا دیا غزل کو لبادہ خیال کا

توحید کاملؔ کی شاعری کو راقم الحروف نے 'سنگ ناتراشیدہ' کے عنوان سے ترتیب دے کر کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

شعور آشناؔ کا شمار بھی برہان پور کے کہنہ مشق شاعروں میں کیا جاسکتا ہے۔ فعال اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ ادب و شاعری کے علاوہ شعور آشناؔ نے سماجی اداروں سے منسلک رہ کر بھی قابلِ قدر کام کئے ہیں لیکن شاعری ہی اول تا آخر ان کی ذات وحیات میں مقدم حیثیت رکھتی ہے۔ گلشنِ ادب اردو لائبریری میں اپنے احباب کے ساتھ ادب نواز اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ آپ کا افسانوی مجموعہ 'اور کتنی دیر' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ شعور آشناؔ نے برہان پور کی نمائندگی مشاعروں کے حوالوں سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں کی ہے۔ شعور آشنا کی شاعری زندگی کے چھوٹے چھوٹے تجربات ومشاہدات کے اظہار سے عبارت ہے۔ مثبت قدروں کی پاسداری اور منفی سوچ کے خلاف سینہ سپر ہوجانے کا حوصلہ شعورؔ کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں وہ اس قدر انوکھے انداز میں اپنی بات یا احساس کو پیش کر جاتے ہیں کہ سنتے یا پڑھتے ہی بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر ؎

ہجومِ حشر بپا تھا کسی سے کیا کہتے
ہر ایک شخص خدا تھا کسی سے کیا کہتے

موجودہ عہد انسانی روّیوں کے زیر اثر نفسا نفسی کا عہد ہی کہا جاسکتا ہے۔ آج کا انسان اپنی ذات اور ذاتی مفاد میں اتنا محو ہو چکا ہے کہ اسے اپنے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ گویا شاعر کے نزدیک ہر شخص اپنے آپ کو خدا گردانے ہوئے ہے۔ اسی طرح فکری تصرفات اور ذات سے گذر کر خدا کی صفات تک پہنچنے کا راستہ متعین کرنے کا سخت مرحلہ شعور آشناؔ کتنی آسانی سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ کریں ؎

جس گھڑی ہم پر خودی کا فلسفہ روشن ہوا
ذات کے اندھے سفر میں راستہ روشن ہوا

چند شعر اور دیکھیں ؎

روح سے پاکیزگی اور جسم سے سر لے گیا
دیکھتے ہی دیکھتے وہ سارے جوہر لے گیا
ذہن ودل نے جب کیا ہے احتسابِ زندگی
میری نظروں میں سبھی اچھا برا روشن ہوا

تاج محمد تاجؔ کی شاعری کی عمر تقریباً ایک دہائی کے آس پاس ہے۔ ہر چند شاعری یا فن جس طرح کی کہنہ مشقی کا تقاضہ کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تاجؔ کی شاعری کی عمر بہت مختصر ہے مگر اس قلیل عرصے میں اس نے اپنے لہجے اور فن کو جس فنی خوبیوں سے آراستہ کیا ہے اس نے تاجؔ کو پہلے اور بعد کی نسل کے درمیان وقار بخشا ہے۔ تاجؔ بہت سنبھل کر شعر کہنے کا سلیقہ جانتا ہے۔ فن کی باریکیوں سے واقف ہونے کا احساس اس کے یہاں موجود ہے۔ کسی بھی خیال یا تجربہ کو نظم کرتے وقت وہ غزل کی انفرادیت اور حسن کا خاص التزام رکھتا ہے۔ شاید تاجؔ نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے معاصرین جس طرح کی غزل بنانے میں مصروف ہیں وہ کسی دیرپا اثرات کی حامل نہیں ہے۔ اسی لئے اس نے فنی چابک دستی کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ ہی روایت اور شعریات کے ساتھ غزل بنانے کی کوشش کی ہے شعر ملاحظہ کریں ؎

بے کیفیٔ موسم پر اتنا مایوس نہ ہو اے کشت سخن
ہم بادل بن کر آئے ہیں تری مٹی نم کرنے کے لئے

اس شعر کے ذریعہ شاعر کے مافی الضمیر اور اس کے محسوسات کی ہلچل کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جس نے اسے اپنے ادبی منظرنامے کی یکرخی/ بے کیفی کے سبب بے چین کیا ہے۔ اس بے چینی اور بے کیفی کے مدنظر تاج نے پورے اعتماد کے ساتھ شاعری کی ہے۔ غزل کی شاعری میں ابہام اور علامت کی خوبیوں سے کون انکار کرسکتا ہے۔ شاعری میں استعارہ اور ابہام کے خلاّقانہ استعمال نے غالبؔ کی شاعری کو اکیسوی صدی میں بامعنی رکھا ہے۔ غالبؔ کی مثال ضمناً ابہام اور استعارے کی خوبیوں کو بیان کرنے کی غرض سے پیش کی گئی ہے۔ یہاں ہم تاجؔ کے ایک شعر پر دراصل گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ جس میں موجود ابہام اور استفہامیہ انداز نے عجیب و غریب صورتِ حال پیدا کردی ہے ؎

میں بھی تو شرمسار ہوں کچھ تجربوں کی موت پر
مجھ کو بھی اپنی فکر کا چہرہ دکھا دیا گیا

تاجؔ کا یہ شعر کئی سوالات ذہن میں پیدا کرتا ہے۔ اس شعر میں کلیدی الفاظ 'میں بھی ،تجربوں کی موت، فکر کا چہرہ' وغیرہ نے یہ صورت پیدا کردی ہے۔ سب سے پہلا سوال تو یہی ہوتا ہے کہ شاعر نے میں بھی کا لفظ استعمال کیا یعنی اور بھی لوگ اس سے پہلے تجربوں کی موت پر شرمسار ہوچکے ہیں۔ دوسرا سوال کون سے تجربات؟ یا کس نوعیت کے تجربے تھے جس سے شاعر یا واحد متکلم شرمسار ہے؟ اور وہ تجربے زندگی اور زمانے کے کن معاملات سے متعلق ہیں؟ ہر چند اس کا جواب شعر کے مصرعہ ثانی میں کسی حد تک موجود ہے۔ فکر کا چہرہ یا نتیجہ دیکھنے کی وجہ سے شرمساری کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ مگر یہاں بھی 'فکر کا چہرہ' سوال پیدا کرتا ہے کہ کون سی فکر، کس طرح کی فکر کے نتائج کے ذیل میں واحد متکلم اپنے تجربوں سے شرمسار ہے؟ ان سوالات کے جوابات کے لئے لفظ فکر ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اگر اس لفظ کے ذریعہ شعر میں موجود استفہام اور تجسس کی گرہ کشائی کی جائے تو شعر اپنے موضوع کے لحاظ سے تاریخ شعور، ادراک اور فلسفہ کی کائنات کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ دنیا اور کائنات کے مسائل اور معاملات اور انسانی وجود کی پر اسرار گتھیوں کو سلجھانے کے لئے ودوانوں اور فلسفیوں نے بہت ہی عجیب وغریب تشہیر وتعبیر پیش کی ہیں۔ البیر کامیو سگمنڈ فرائڈ، فوکو، آئنسٹائن جیسے سائنسداں اور فلسفی انسانی وجود، شعور، لاشعور، تحت الشعور، وجودیت کے مسائل، کائنات کی حقیقت کی سریت کی تلاش میں جن نتائج تک پہنچتے ہیں ان میں ہندوستان کے قدیم ویدانتی فلسفہ کا اہم نکتہ صفر (شونیہ) ہاتھ آتا ہے۔ ہر چند مذکورہ دانشوروں کے نظریات عالمی سطح پر ذہن و فکر کو تبدیل کرنے کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ مگر ان کے تمام تگ ودود کا حاصل صفر کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔ یہی نتیجہ ہمارے ذہن کو انتہائی قدیم ترین فلسفیانہ مباحث کی طرف منتقل کردیتا ہے۔ جہاں سیکڑوں سال قبل ناگ ارجن نے ہندوستان میں صفر یعنی شونیہ کے فلسفہ کو پیش کیا۔ یہ نکتہ مشرقی نظری مباحث کے ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔ ورنہ مشرق کے اس فلسفے سے مغرب کے مفکرین یا مذکورہ دانشوروں کا کوئی ربط نہیں ہے۔

دارالسرور برہان پور میں جن نوجوان شاعروں نے اپنی اہمیت اور کلام سے متاثر کیا ہے ان میں فاروق نورؔ کا نام بھی کسی حد تک اہم کہا جاسکتا ہے۔ ہر چند فاروق نورؔ کے یہاں فنی پختگی پیدا نہیں ہوسکی ہے، مگر اس نے پنے ساتھ شاعری کا آغاز کرنے والے شاعروں میں انفرادی رنگ پیش کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ برہان پور میں شعروادب کی تخلیق کرنے والے اور اس سے جذباتی وابستگی محسوس کرنے والے لوگوں میں زیادہ تر مزدور طبقہ شامل ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شاعری میں کسی بڑی فکر کو نقطۂ ارتکاز بنانے کے بجائے زندگی کے شب وروز کے تجربے اور مشاہدے سے ہی شاعری عبارت ہوتی ہے۔ فاروق نورؔ کے کچھ شعروں کا مطالعہ یہاں غیر ضروری معلوم نہیں ہوتا ؎

اسی چمن سے مجھے خوشبوئیں نہیں ملتیں
کہ جس کے پھولوں کو برسوں بہاردی میں نے
اک ذرا بات پہ رشتوں کے بھرم ٹوٹ گئے
ہوگئے در بھی الگ ہوگئی دیوار الگ

فاروق نورؔ نے غزل کے بنیادی مزاج کے مدنظر عاشق و معشوق کے کرداروں یا معاملات عشق و وارفتگی کے ذیل میں جو اشعار قلم بند کئے ہیں وہ اپنی تازگی اور کیفیت کے لحاظ سے بہت اہم معلوم ہوتے ہیں۔ فنی پختگی سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر اس کے یہاں تخلیق ہونے والے ایسے ہی تجربات کو دیکھا جائے تو حیرت و استعجاب کے ساتھ نشاط انگیز کرب کی لذت بھی محسوس کی جاسکتی ہے ؎

ہم بھی یوسف تھے تو کم دام میں بکتے کیسے
اپنا بازار الگ اپنے خریدار الگ
پلک ہماری نہائی نہیں بہت دن سے
تمہاری یاد بھی آئی نہیں بہت دن سے

اردو غزل کی تہذیبی روایت جس میں معشوق کی اہمیت اور اس کے تعلقِ خاطر نے شاعروں/ عاشقوں کو ہمیشہ ستم زدہ، آشفتہ اور نحیف و نزار کردار کی شکل میں پیش کیا ہے۔ عاشق کی ان کا اثبات اور معشوق کو بحیثیت انسان کے خطا کا پتلا گردانے کا رویہ میرؔ کے یہاں موجود ہے۔ جو بعد میں غالبؔ، فیضؔ، ناصر کاظمیؔ سے ہوتا ہوا جدید غزل کے شاعروں کے یہاں باقاعدہ رجحان کی شکل اختیار کر گیا۔ اس رویے کو رجحان بنانے کا کا سہرا فراقؔ گورکھپوری کے سر ہے۔ شعری تہہ داری سے قطع نظر فاروق نورؔ جیسے نومشق شاعر کے یہاں اس رجحان کے زیر اثر عمدہ شعر موجود ہیں ؎

اک تعلق جو تو نے توڑ دیا
ٹوٹ جانے کے انتظار میں تھا
ترے بغیر بھی اک رات جی کے دیکھ لیا
ترے بغیر بھی یہ رات خوبصورت ہے
تم نے پتھر کے پھول دیکھے ہیں
ہم نے دیکھا ہے پھول سا پتھر

وقارؔ آصفی برہان پور میں نووارد شاعروں کی صف میں شامل ہے۔ وقارؔ نے اپنے سنجیدہ لب ولہجہ سے متاثر ضرور کر لیا ہے مگر فنی پختگی کی کمی کا احساس بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری میں امکانات و نمو پذیری کے حوالے دیکھے جاسکتے ہیں۔ آج کے مشاعرے جس وقتی اور ہنگامی تخلیقات اور بے رس شاعری کے لئے جانے جاتے ہیں اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس چکاچوندھ میں بہت سے سنجیدہ لکھنے والوں کو بھی اپنے معیار و وقار کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مشاعروں میں گلا باز نوجوانوں کی تعداد بڑھتی ہی جارہی ہے۔ وقارؔ آصفی نے اپنا رشتہ مشاعروں سے نہیں بلکہ ادب کے سنجیدہ قاری اور سامع سے استوار کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے یہاں سطحی انداز کے شعر بھی مل جاتے ہیں مگر ان سے صرفِ نظر کرنا چاہئے۔

وقارؔ کی شاعری میں طنز کی جھلک موجود ہے۔ اگر وہ غزل میں اس انداز کو سنوارنے کی کوشش کریں تو میرا خیال ہے کہ یہی ان کے اسلوب کا حوالہ ہوسکتا ہے ؎

کس نے دی ہیں دعائیں جینے کی
کس نے دریا دلی دکھائی ہے

ایسے ماحول میں جہاں لوگ ایک دوسرے کی جان کے دشمن اور خود غرضی کے اندھیروں میں غرق ہیں وہاں جینے کی دعا دینا یقینی طور پر حیرت ہے۔ اس کسمپرسی کی فضا میں شاعر اس کشادہ دلی پر طنزیہ انداز میں کہتا ہے۔ 'کس نے دریا دلی دکھائی ہے' یہی طنزیہ انداز صورت حال کو مزید واضح کر دیتا ہے ؎

تجھے یہ فکر مرے گھر میں آگ لگ جائے
مجھے یہ ڈر کہ ترا ہاتھ جل نہ جائے کہیں

سفیر حق کو بھی صحن مکاں میں رکھا ہے
یقیں کو آپ نے حد گماں میں رکھا ہے
ایک فنکار کا پتھر میں اثر باقی ہے
کٹ گیا ہاتھ مگر اب بھی ہنر باقی ہے
چاند بے چین ہونے لگتا ہے
دور نظروں سے ہوں اگر تارے

سرزمین برہان پور کے ان پانچ شاعروں پر جو تاثراتی اور تنقیدی انداز میں گفتگو کی گئی ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی خاک سے نمو پذیری کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ ہر زمانے کی طرح موجودہ عہد میں بھی برہان پور میں خاطر خواہ رہنمائی کرنے والا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو معاصر ادبی رجحانات اور ترجیحات کی بابت نئے کہنے والوں کو متعارف کرا سکے، وگرنہ ایسے ذہن ہر دور میں برہان پور کی مٹی سے پیدا ہوتے رہے ہیں جو سہی رہنمائی اور قدر و منزلت سے محروم ہوجانے کی صورت میں قصۂ پارینہ بن گئے۔ جب تک آپ اپنے خول سے باہر آکر اور سستی شہرت اور مقبولیت سے احتراز کرنے کے ساتھ ہی پورے ادبی منظر نامے سے واقف نہیں ہوتے تب تک کسی بڑے فکری اور لائق تقلید/ کارنامے کی توقع بے سود ہی رہے گی۔

سطور بالا میں برہان پور کے جن شاعروں کے کلام کو اختصار کے ساتھ زیر بحث لایا گیا ہے اسے ادبی طور پر اپنے دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش سمجھنا چاہئے۔ ہماری آئندہ بھی کوشش رہے گی کہ اس طرح مختلف موقعوں سے مختلف شاعروں اور ان کے کلام کو سنجیدہ لوگوں کے روبرو پیش کیا جاسکے اور برہان پور کے ادباء شعراء اپنے علمی و ادبی محاسبہ کے ساتھ ہی مستقبل کے لئے کوئی نمایاں کارکردگی پیش کر سکیں۔

☆☆☆

جیلانی بانو: بحیثیت افسانہ نگار

ڈاکٹر نارائن پاٹیدار

بھگت سنگھ گورنمنٹ ڈگری کالج، جاورہ، رتلام (ایم۔پی) پن: 457226، (موبائل:8305365238)

پدم شری جیلانی بانو کا شمار اردو کی ممتاز و منفرد خواتین فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ افسانہ نگاری کے میدان میں انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے افسانوں کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ انھوں نے ملیالم کہانیوں کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ریڈیو و اسٹیج کے لئے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۴ جولائی ۱۹۳۶ء کو بدایوں اتر پردیش میں ہوئی مگر پرورش و پرداخت حیدرآباد میں ہوئی۔ کیونکہ ان کے والد علامہ حیرت بدایونی بہ سلسلہء ملازمت مع اہل وعیال حیدرآباد آ کر بس گئے اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کی شادی اسی شہر میں ہوئی اور اسی شہر کو انھوں نے اپنا مسکن بنایا۔ اردو زبان وادب سے انسیت انھیں ورثہ میں ملی ان کے والد اپنے زمانے کے بڑے عالم وشاعر تھے ان کے گھر پر بڑے بڑے شعراء وادباء مثلاً سجاد ظہیر، مخدوم محی الدّین، جگر مرادآبادی، کرشن چندر اور مجروح سلطانپوری وغیرہ کا آنا جانا لگا رہتا۔ ایسے علمی وادبی ماحول سے ان کے ذوق علم میں اضافہ ہوا اور ان میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم ان کی گھر پر ہی ہوئی۔ ۱۹۶۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے۔ کیا اور پھر اردو میں ایم۔اے۔ کیا۔ باضابطہ اسکول یا کالج نہیں گئیں بلکہ بیشتر امتحانات انھوں نے پرائیوٹ ہی پاس کیے۔ اس لئے کہ اس زمانے میں لڑکیوں کو تعلیم دینا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا پھر پردے کی قید و بند کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ انھوں نے ایسے سبھی مسائل کا سامنا کیا اور مثبت انداز میں ترقی کے راستے پر چلتی رہیں۔ بچپن ہی سے انھیں مطالعے کا شوق تھا۔ ابتدائی عمر میں ہی میر تقی میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، گورکیؔ، موپاساںؔ، چیخوفؔ، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، فیض احمد فیضؔ، اسرارالحق مجازؔ، قرۃ العین حیدر اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ تمام بڑے شعراء وادباء کی تصانیف کا مطالعہ کر لیا۔ ان عظیم مصنفین کی تخلیقات کے مطالعے اور گھر کے ادبی ماحول نے ان کی ادبی تربیت اور صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی۔

دراصل جیلانی بانو کی ادبی زندگی کا آغاز ترقی پسند تحریک کے عروج کا آخری دور تھا۔ اس وقت اردو ادب میں بڑے بڑے فکشن نگار اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے اور اس وقت تک اردو افسانہ ترقی کی مختلف منازل طے کر چکا تھا مگر موضوعات کی قلّت بھی درپیش تھی۔ اس دشوار گزار مرحلہ میں جیلانی بانو نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانوں سے کیا جسے اہل ادب نے سراہا اور حوصلہ افزائی کی۔ مشہور شاعر مخدوم محی الدّین اپنے ایک خط (۱۹۵۹ء) میں لکھتے ہیں:

> ''جیلانی بانو حیدرآباد کے ان نوجوان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے باوجود پردے کی قید و بند کے، زندگی سے نزدیک رہ کر اس کی تصویر بنانے کی کوشش کی ہے۔ قابلیت اور تحریروں کے نفس مضمون نے انہیں ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں بہت جلد مقبول اور مشہور بنا دیا ہے۔''

(دور کی آوازیں۔ خطوط کا انتخاب۔ جیلانی بانو۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۰ء ص ۴۸۵)

جیلانی بانو کے ناول اور ناولٹ کو ادبی دنیا میں بڑی شہرت ملی۔ ان کا پہلا ناول ''ایوانِ غزل'' فروری ۱۹۷۶ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی سے شائع ہوا۔ اس ناول کو اردو ناول کی دنیا میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ جیلانی بانو کا ایک اور اہم ناول ''بارشِ سنگ'' کے نام سے کراچی (پاکستان) سے شائع ہوا۔ ہندوستان میں یہ ناول پہلی بار ۱۹۸۵ء میں منصف آفسیٹ پریس حیدرآباد سے شائع ہوا۔ انھوں نے یہ ناول تلنگانہ تحریک سے متاثر ہو کر لکھا۔ یہ ناول حیدرآباد اور اس کے اردگرد کے گاؤں کے غریب مزدوروں اور محنت کش کسانوں کی زبوں حالی کی عکاسی کرتا ہے۔

جیلانی بانو کے کئی ناولٹ کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں پہلا ہے ''جگنو اور ستارے''۔ اس میں تین ناولٹ شامل ہیں: (۱) دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پر، (۲) جگنوں اور ستارے (۳) رات۔ دوسرا مجموعہ ہے ''نغمے کا سفر''۔ یہ ۱۹۷۷ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں چار ناولٹ ہیں: (۱) اکیلا (۲) پتھر کا جگر (۳) کیمیائے دل (۴) نغمے کا سفر۔ ان کے علاوہ کئی ناولٹ رسائل و جرائد میں بھی شائع ہوئے۔ ان کے متعدد

افسانوی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے لئے متعدد بار انھیں اعزازات سے نوازا گیا۔ اس سلسلے میں آندھر پردیش اردو اکا دمی ایوارڈ (۱۹۷۳ء)، اتر پردیش اردو اکا دمی ایوارڈ (ایوان غزل کے لئے (۱۹۷۷ء)، بہار اردو اکا دمی ایوارڈ (نغمے کا سفر کے لئے ۱۹۷۸ء)، اتر پردیش و بنگال اردو اکا دمی ایوارڈ افسانوی مجموعہ پرایا گھر کے لئے ۱۹۸۰ء)، دو شیزہ میگزین کراچی ایوارڈ (۱۹۸۱ء)، سویت لینڈ نہرو ایوارڈ (۱۹۸۵ء)، کل ہند ایوارڈ (مہاراشٹر اردو اکا دمی ۱۹۸۸ء)، کل ہند قومی حالی ایوارڈ (ہریانہ اردو اکا دمی ۱۹۸۹ء)، نقوش ایوارڈ (نقوش میگزین لاہور ۱۹۹۱ء)، مجلس فروغ اردو دوحہ قطر کا نشانِ امتیاز ایوارڈ (۱۹۹۸ء) اور پدم شری ایوارڈ (۲۰۰۱ء) وغیرہ اہم ہیں۔

ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''روشنی کے مینار'' ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ء میں سویرا آرٹ پریس نیا ادارہ لاہور (پاکستان) سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ۱۵ / افسانے ہیں۔ موم کی مریم، ڈریم لینڈ، مٹّی کی گڑیا، دیوداسی، بھنور اور چراغ، پنچوں کی رائے، فصلِ گل جو یاد آئی، چھٹکارا، بہاروں کے بیچ، ایک انار، چھمیا، نئی عورت، آگ اور پھول، تلچھت اور روشنی کے مینار اس مجموعہ میں شامل افسانے ہیں۔

''نِروان'' جیلانی بانو کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ ۱۴ / افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ پہلی بار کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی سے اپریل ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ انتظار، دوشالہ، ستی ساوتری، نِروان اور کیدارا وغیرہ جیسے بہترین افسانے اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ افسانوی مجموعہ ''پرایا گھر'' جیلانی بانو کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جو ۲۱ / افسانوں پر مشتمل ہے یہ مجموعہ پہلی بار دسمبر ۱۹۷۹ء میں اردو مرکز حیدرآباد سے شائع ہوا۔ پرایا گھر، اسکوٹر والا، اے دل اے دل، سنہرا ہرن، ایک دن کیا ہوا، اسٹل لائف، اجنبی چہرے، میں اور میرا خدا اور ادّو وغیرہ افسانے اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

چوتھا افسانوی مجموعہ ''روز کا قصّہ'' (۱۹۸۷ء) میں شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ ''تِریاق'' پہلی بار کراچی (پاکستان) سے فروری ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک ضخیم مجموعہ ہے، اس مجموعہ میں اس وقت تک کے شائع ہونے والے چاروں افسانوی مجموعوں (روشنی کے مینار، نِروان، پرایا گھر اور روز کا قصّہ) کو یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔

افسانوی مجموعہ ''سچ کے سوا'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۷ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ۲۰ / افسانے شامل ہیں۔ افسانوی مجموعہ ''بات پھولوں کی'' پہلی مرتبہ ۲۰۰۱ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں افسانوں کی تعداد ۲۰ ہے۔ ''راستہ بند ہے'' مصنفہ کا مشہور افسانوی مجموعہ ہے جو ۲۰۱۰ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے بہترین افسانوں کا ایک انتخاب (جس کے مرتب آصف فرخی صاحب ہیں) ''یقیں کے آگے گماں کے پیچھے'' کے عنوان سے ۲۰۱۴ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا ہے۔

جیلانی بانو ایک کامیاب اور کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ ان کا ادبی سفر طویل مدت کو محیط ہے انھوں نے اردو افسانہ کے مختلف ادوار کو دیکھا ہے چنانچہ ان کے یہاں کینوس کا دائرہ بہت وسیع نظر آتا ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر افسانے قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے سیاسی، سماجی، معاشی مسائل کی عکاسی بڑی دیانت داری سے کی ہے۔ جیلانی بانو نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی سے متعلق مختلف واقعات و مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ خصوصاً عورت کی زندگی کو انھوں نے کئی زاویوں سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ عملی طور پر بھی وہ عورتوں اور بچوں کے لئے کام کرتی ہیں۔ وہ عورتوں کو ان پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے اور اپنے حقوق کے لئے لڑنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کے تحفظ کو اپنا مرکزی خیال بنایا ہے۔

جیلانی بانو کا پہلا شاہکار افسانہ ''موم کی مریم'' جسے فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسی نامراد لڑکی "قدسیہ" کی کہانی ہے جو ضدّی ہونے کے ساتھ رحم دل اور مہربان بھی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا استحصال بھی ہوتا ہے۔ جیلانی بانو نے قدسیہ کے سہارے عورتوں کے ذہنی و نفسیاتی خیالات اور ان کی معصومیت و ہمدردی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ افسانہ ''اسکوٹر والا'' ذہنی کشمکش میں مبتلا ایک ایسی عورت (عابدہ) کی کہانی ہے جو اپنے سسرال سے الگ رہ رہی ہے۔ وہ اتنی معصوم ہے کہ اسکوٹر کی آواز سے پریشان ہو کر اسکوٹر والے کو کوستی رہتی ہے۔ اس کے بعد یکا یک اسکوٹر والا غائب ہو جاتا ہے اور محلّے میں ایک موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔

عابدہ نے کہیں سن رکھا تھا کہ کسی کی بد دعاؤں سے کوئی مر بھی سکتا ہے چنانچہ اس کے ذہن میں بار ہا یہی خیال گردش کرتا ہے کہ اس کی بد دعاؤں کے اثر سے اسکوٹر والے کی موت ہوگئی ہے لیکن جب اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکوٹر والا زندہ ہے اور اس کو اسکوٹر سے نکلنے والی آواز سنائی دیتی ہے تب خوشی کے مارے وہ اچھل پڑتی ہے۔ جیلانی بانو کا یہ افسانہ عورت کی معصومیت اور اس کی نفسیات کی بہترین مثال ہے۔ افسانہ ''ستی ساوتری'' بھی عورتوں کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ افسانہ کی راوی لڑکی مختلف لڑکیوں کی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ خود کے دلی جذبات کا اظہار کرتی ہے۔

مختصر یہ کہ یہ افسانہ نہ صرف عورتوں کی مظلومیت ان کی نفسیاتی الجھنوں اور مجبوریوں کی جانب اشارہ کرتا ہے بلکہ ہمارے سماجی نظام پہ یہ سوالیہ نشان بھی لگاتا ہے کہ کیوں عورت کو مرد سے کمتر سمجھا جاتا ہے۔

افسانہ ''اب انصاف ہونے والا ہے'' عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ اس افسانہ میں جہیز کا لالچی انسپکٹر جمال اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہے مگر کیا مجال کہ کوئی مہذب پڑوسی اسے بچا سکے۔ ڈاکٹر شاہد حسین جو ماہر سماجیات ہیں اور ہر وقت سماجی مسائل کو حل کرنے کی تدابیر تلاش کرتے رہتے ہیں لیکن جب پولس والے گواہی لینے ان کے گھر آتے ہیں تو سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ یوں پیش آتے ہیں جیسے انھیں کچھ خبر ہی نہ ہو۔ کہتے ہیں:

''بات دراصل یہ ہے انسپکٹر صاحب کہ میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ ہندوستان کے سماجی مسائل پر غور کرنے سے مجھے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ عورتوں کی چیخ وپکار پر وقت ضائع۔۔۔۔۔۔''

(مجموعہ۔ سچ کے سوا۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی بار اوّل ۱۹۹۸ء ص ۲۰)

اس افسانے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ہمارے ترقی یافتہ سماج میں اب تک نہ تو عورتوں کی ابتر حالت میں قابلِ لحاظ تبدیلی ہوئی ہے اور نہ ہی جہیز کا مسئلہ حل ہوا ہے۔ افسانہ ''میں'' میں دولت کی لالچی موسی ایک کم سن لڑکی سرسوتی کی شادی ایک ضعیف امیر سبرامنیم کے ساتھ طے کر دیتی ہے اور کہتی ہے:

''اے بیٹا اس غریب بڑھیا کو نہ بھول جانا۔ تمھیں چاندسی دلہن دلوائی ہے۔ تمھیں کیا معلوم محلے والے تو میری جان کھا لیں گے کہ پندرہ برس کی چھوکری پچاس برس کے بڈّھے کو سونپ دی۔''

(مجموعہ۔ نروان۔ کوہِ نور پرنٹنگ پریس دہلی بار اوّل اپریل ۱۹۶۳ء ص ۳۱)

افسانہ ''سنہرا ہرن'' میں اس قدیم قصّے کا ذکر ہے جس میں رام کی بیوی سیتا کو راون اغوا کر لیتا ہے جس کی وجہ ایک سنہرا ہرن ہوتا ہے جسے پانے کے لئے سیتا رام کو اس کے پیچھے بھیج دیتی ہے۔ اس قدیم قصّے کے پس منظر میں کہانی کی راوی (جو نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہے) کی ازدواجی زندگی بھی پیش کی گئی ہے۔ گھر کی چار دیواروں میں قید ہو کر رہ گئی کہانی کی کردار گھر سے باہر نکل کر آزاد ہونا چاہتی ہے۔ وہ آزادی اور معصومیت سے بھری اپنی بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے ویسی ہی زندگی بسر کرنا پسند کرتی ہے:

''۔۔۔۔میں اس رام کو تلاش کرتی ہوں جو میرا تھا جس نے میرے گرد تین لکیریں کھینچ دی تھیں ۔۔۔۔حالانکہ وہ جانتا تھا کہ سنہرے ہرن مجھے بہکانے کے لئے چاروں طرف بھیجے گئے ہیں اور پھر میں اس جال کے اندر الجھنے لگتی ہوں جو کسی راون نے میرے لئے پھیلایا ہے۔''

(مجموعہ ۔ پرایا گھر ۔ اردو مرکز حیدرآباد بار اوّل دسمبر ۱۹۷۹ء ص ۱۰۵)

جیلانی بانو نے اس افسانہ کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زمانہ قدیم سے عورتوں کا استحصال جاری ہے کبھی انھیں سنہرے ہرن کا لالچ دیا جاتا ہے تو کبھی کسی اور بہانے سے بہلا پھسلا کر جنسی ہوس کا شکار بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ''ڈریم لینڈ'' بھی ایسا ہی افسانہ ہے جو عورتوں کے استحصال سے وابستہ روایت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

افسانہ ''نروان'' میں جیلانی بانو نے دیہی زندگی اور دیہاتیوں کی ضعیف الاعتقادی کے ساتھ جنسی استحصال کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ۔ باہر سے آئے سادھو مذہب کے نام پر گاؤں والوں کا استحصال کرتے ہیں ۔ ایک سادھو تو ایک لڑکی (رتنما) کو پاپ معاف کرانے کے بہانے اندھیرے جنگل میں لے جاتا ہے اور پھر ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد اس کی حالت کیسی ہوتی ہے اس کا منظر دیکھئے:

''۔۔۔۔ سادھو خود ہی رتنمّا کی باہیں پکڑے اسے گھسیٹتا ہوا لا رہا تھا ۔ رتنمّا کے بال کھل گئے تھے۔ ساری جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور وہ پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔۔۔۔''

(مجموعہ۔ نروان۔ کوہِ نور پرنٹنگ پریس دہلی باراوّل اپریل ۱۹۶۳ء ص ۱۴۱)

جیلانی بانو نے اپنے مختلف افسانوں کی طرح اس افسانہ میں بھی راون کا ذکر کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج بھی دنیا میں ہر طرف ہوس، بدی اور نا انصافیوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ضرورت ہے تو بس انھیں آگ لگا دینے کی ہے۔

افسانہ ''آگہی'' ایک ایسی عورت (ستارہ) کی کہانی ہے جو جنسی ہوس کا شکار ہونے سے کسی طرح خود کو بچا لیتی ہے اور اس کے ساتھ کی جانے والی بدسلوکی کے ذمہ دار عادل کو سزا دلوانا چاہتی ہے کہتی ہے:

''میں تو اس کتّے کو موت کی سزا دلواؤں گی۔ بھلا کوئی حد ہے۔ یہ دو کوڑی کے مرد کیا سمجھتے ہیں کہ جب چاہیں کسی عورت کی عزت پر حملہ کر دو۔ اب اسے معلوم ہوگا کہ مذاق نہیں ہے میری اس طرح توہین کرنا۔''

(مجموعہ۔ سچ کے سوا۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی باراوّل ۱۹۹۸ء ص ۵۷)

مگر ہوتا یہ ہے کہ ستارہ کا خسر کہتا ہے: ''بدقسمتی سے ایسی بات ہو جائے تو اسے وہیں ختم کر دینا چاہئے۔ اب سارے شہر میں بدنامی ہوگی۔'' ستارہ کے والد بھی چاہتے ہیں کہ کیس واپس لے لیا جائے۔ اتنا ہی نہیں شوہر خالد تو ستارہ کو ہی اس حادثے کا قصوروار ماننے لگتا ہے۔ آخر میں ستارہ عادل کے گھر جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے: ''میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کہ آپ کی بدولت میں ساری دنیا کو جان سکی۔۔۔۔'' افسانے کا یہ آخری جملہ ہمیں نہ صرف شرم سار کرتا ہے بلکہ ہمارے کرم خوردہ سماج کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے۔

جیلانی بانو کے افسانوں میں جدیدیت کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے فرد کی تلاش، تنہائی کا کرب، انسان اور انسانی رشتوں کی بے قدری کے ساتھ سیاسی و سماجی تبدیلی سے وابستہ مختلف پہلوؤں کی عکاسی بڑی خوبی سے کی ہے۔ افسانہ ''اپنے مرنے کا دکھ'' ہمارے موجودہ سماج (جس میں انسانی رشتوں کی بے قدری عروج پر ہے) کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص (صادق) کی کہانی ہے جو اہلِ خانہ کی کفالت کے لئے دوبئی میں کام کر رہا ہے۔ ایک دن یکا یک اسے یہ اطلاع ملتی ہے کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ مگر وہ زندہ تھا۔ اسے بارہا اپنے گھر والوں کا خیال آتا ہے کہ اس کی موت کی خبر سن کر ان لوگوں پر کیا گزری ہوگی۔ اسے کبھی اس کے والدین کی محبت یاد آتی ہے تو کبھی ان حسین لمحوں کی جو اس نے اپنی بیوی ثریا کے ساتھ گزارے تھے۔ اسی کشمکش میں وہ ٹیلی فون بوتھ پر جاتا ہے کہ پھر اسے یہ خیال ستاتا ہے کہ:

''فون کون اٹھائے گا۔۔۔؟ ثریا۔۔۔؟ مگر وہ تو غم کی شدت سے بے ہوش ہوگی۔۔۔ امی۔۔۔؟ انہیں تو اب تک کسی کلینک میں شریک کر دیا گیا ہوگا۔۔۔ ابا۔۔۔؟ بھلا اپنے اکلوتے بیٹے کے مرنے کی خبر سننے کے بعد کیا ابا اب تک زندہ ہوں گے۔''

(مجموعہ۔ سچ کے سوا۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی باراوّل ۱۹۹۸ء ص ۸۴)

آخر کار ذہنی پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے صادق اپنے گھر فون لگاتا ہے اور خود کو منیر بتا کر بات کرتا ہے۔ ثریا اسے فون پر کہتی ہے:

''منیر بھائی ذرا یہ معلوم کیجئے کہ صادق کے پراویڈنٹ فنڈ کا کتنا روپیہ ہے۔ یہ سب روپیہ مجھے ملنا چاہئے۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ میری ساس اور خسر مجھ سے بہت لڑائی جھگڑے کر رہے ہیں روپے کے لئے، میں بیچاری بیوہ۔۔۔'' اس کے بعد وہ اپنے والد سے بھی نام (خالق) بدل کر بات کرتا ہے۔ اس کے والد کہتے ہیں: ''ہم پر تو مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ہماری بہو صادق کا تمام روپیہ خود لینا چاہتی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ہم دونوں کا کھانا پینا۔۔۔'' اور پھر خالق کے یہ کہنے پر کہ میرے سامنے صادق کی لاش ہے اس کا کیا کروں؟ صادق کے والد بڑی محبت اور شفقت سے کہتے ہیں: ''اسے تم دفن کر دو بیٹا۔۔۔'' مختصر یہ کہ صادق کی موت کی خبر سن کر اس کے والدین اور بیوی غم زدہ ہونے کے بجائے اس کی موت پر ملنے والے روپیوں کے لئے جس طرح آپس میں جھگڑتے ہیں اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس فریبی دنیا میں رشتوں اور انسانوں سے زیادہ دولت کی قدر ہے۔

افسانہ ''ایک دوست کی ضرورت ہے'' تنہائی کے کرب میں مبتلا ایک ایسے ریٹائرڈ شخص

(شیام) کی کہانی ہے۔ جو آرکیٹکٹ ہے۔ اس نے کئی ڈیم بنائے اور لاکھوں روپے کا ہیر پھیر کیا۔ اس طرح اس نے اپنی زندگی میں خوب کامیابی اور دولت حاصل کر کے بہت بڑا گھر تو بنا لیا مگر سکون نہیں خرید سکا۔ جیلانی بانو کا یہ افسانہ آج کے انسان کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ انسان جو حصول دولت کی مصروفیتوں میں قید ہو کر رہ جاتا ہے تو وہ سماجی رشتوں سے دور ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنہائی کا کرب اسے ستانے لگتا ہے۔ افسانہ ''اسٹل لائف'' بھی انسان کی مصروفیت اور کشمکش سے بھری زندگی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار صادق اپنے آفس کے کاموں میں اتنا مشغول ہے کہ بیوی بچوں کے ساتھ وقت بتانے سے قاصر ہے۔ اسی لئے وہ خود کو مختلف حصّوں میں منقسم محسوس کرتا ہے۔ افسانہ ''روز کا قصہ'' عورت کی معصومیت اور قربانیوں کے ساتھ اس کی بے قدری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ ایک گھریلو زندگی بسر کرنے والی سات بچوں کی ماں کی کہانی ہے جو خود سے زیادہ دوسروں کے لئے جیتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے اپنی پہچان تک یاد نہیں رہتی صرف ممی بن کر رہ جاتی ہے۔ ہر وقت اہلِ خانہ کی خدمت میں لگی رہتی ہے، اپنے شوہر کی خوشی میں اپنی خوشی تلاش کرتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے وہ احمق اور جاہل ہی کہلاتی ہے۔ افسانہ ''ایک دن لیبر روم میں'' اور ''پردہ گرتا ہے'' بھی عورتوں کی بے قدری اور قربانیوں کی جانب توجہ دلاتے ہیں۔ افسانہ ''پردہ گرتا ہے'' میں جیلانی بانو نے ایک عورت کی زندگی کو ڈرامائی شکل میں بیان کیا ہے۔ یہ وہ عورت ہے جو اپنے بچے اور شوہر کے لئے اپنی ساری خوشیاں قربان کر دیتی ہے۔ وہ دل و جان سے اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے مگر ضرورت پوری ہونے پر یہی بچہ اور شوہر اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

افسانہ ''ایک دن لیبر روم میں'' میں ایک نرس لیبر روم میں آنے والی عورتوں کے ذہنی جذبات اور نفسیات کے ساتھ ان کی قربانیوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے۔ جب ایک مرد اپنی بیوی کو کمزور قرار دیتے ہوئے اس کے حمل کو ضائع کرنے کی بات ڈاکٹر سے کہتا ہے۔ تب نرس کے ذہن میں نکاح نامہ کے معاہدے گردش کرنے لگتے ہیں۔ جیلانی بانو نے اس افسانہ کے سہارے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے سماج میں عورتوں کی بے قدری عروج پر ہے۔ انھیں صرف جنسی ہوس بجھانے کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بچہ بھی مرد کی مرضی کے مطابق پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مرد کہہ دے کہ اسے بچہ نہیں چاہئے تو حمل گرا دیا جاتا ہے۔ اگر وہ لڑکا چاہتا ہے تو لڑکا پیدا کرنا عورت کی ذمہ داری ہے۔ ایسے میں اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو عورت کو ہی ہر طرح سے اس کا گناہگار قرار دے دیا جاتا ہے۔ افسانہ ''پھر میں پیدا ہوں گی'' ایک حمل کی پکار ہے جو لڑکی ہے اور دنیا میں آنا چاہتی ہے۔ مگر اس کا باپ حمل ضائع کروانے کے لئے اس کی ماں پر دباؤ ڈالتا ہے۔ آخر میں حمل کی یہ پکار دل کو تہ و بالا کر دیتی ہے کہ: ''وہ میرا دل اور دماغ نکال پھینکیں گے۔ جس کی انھیں ضرورت نہیں ہے۔ پھر میں پیدا ہوں گی۔۔۔'' بہر کیف مختلف قربانیوں کے باوجود عورتوں کی بے قدری واقعی افسوس ناک ہے۔

جیلانی بانو نے افسانہ ''مجرم'' میں دو دوستوں (نثار اور وینکٹیش) کی ذہنی کیفیات کے سہارے ہمارے سماج میں پھیلے اس خوف اور تشدد کی طرف توجہ مبذول کی ہے جو مذہبی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ نثار اور وینکٹیش بچپن سے ہی دوست ہیں اور ایک ہی آفس میں کام کرتے ہیں لیکن جب ہر طرف دنگا فساد شروع ہوتا ہے تو وہ ایک دوسرے کو نظر انداز کرتے ہیں۔ انھیں ذہنی شرمندگی بھی ہوتی ہے۔ اس افسانہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ چند لوگ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر فساد کرواتے ہیں مگر اس سے عام باشندگان متاثر ہوتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں انھیں حالات کے سبب انسان کے آپسی رشتوں میں تلخی پیدا ہوتی ہے۔

جیلانی بانو ایک بے باک افسانہ نگار ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے حقائقِ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں کیوں کہ وہ بند کمرے میں بیٹھ کر افسانہ تحریر نہیں کرتیں بلکہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں اور معاشرے کو دیکھتی ہیں پس سیاسی حالات کے مدِ نظر کہانی کا تانا بانا تیار کرتی ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے سیاسی حالات و مسائل اور سیاسی اراکین کی کاہلی کو بڑی بے باکی سے اجاگر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں بین الاقوامی سطح پر ہونے والے تلاطم اور جنگی داؤ پیچ سے وابستہ مختلف تصاویر بھی موجود ہیں۔

افسانہ ''یہ شہر بکاؤ ہے'' میں ایک شہر ہے جو بکاؤ ہے۔ یہاں ہر طرف خرید و فروخت کا بازار گرم ہے۔ یہ بازار صدیوں پرانا ہے۔ یہاں فرقہ واریت کی آگ بھڑکانے کے لئے بے شمار ہندو، مسلم بے روزگار بے سہارا نو

جوان مل جائیں گے۔ اس بازار میں انصاف، مذہب، تہذیب اور قانون بھی بکتا ہے۔ اس شہر میں الیکشن کے لئے ضروری ہر چیز مل جائے گی۔ لیڈر، مولوی، پنڈت، غنڈے وغیرہ سب یہاں موجود ہیں مگر اس بازار میں وہ بڑے سیاسی لیڈر نہیں ملیں گے جو بڑے بڑے گناہ کرنے کے باوجود حاکم بنے ہوئے ہیں:

''کیا۔۔۔؟ آپ کو ایک تجربہ کار خطرناک مجرم کی تلاش ہے۔۔۔؟ اسے تو آپ پارلیمنٹ کی کرسیوں پر جا کر پکڑ لیجئے۔۔۔اس بازار میں وہ نہیں ملیں گے۔''

(مجموعہ۔راستہ بند ہے۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۰ء ص ۴۷)

اس شہر میں الیکشن کے وقت بڑے بڑے وعدے کئے جاتے ہیں اور ووٹروں کو طرح طرح کے لالچ سے بہکایا جاتا ہے لیکن جب جیت جاتے ہیں تو عوام کو بھلا دیا جاتا ہے۔ اس شہر میں وہ کالج بھی ہیں جہاں لیڈر بننے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ یہاں لیڈر بننے کے لئے قابلیت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ پوچھا جاتا ہے کہ تم نے کتنے قتل کئے ہیں۔ مختصر یہ کہ جیلانی بانو کا یہ افسانہ ایک شہر کے پس پشت ہندوستان کے سیاسی سسٹم کی نقاب کشائی کرتا ہے اور یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے ملک کا سیاسی ڈھانچہ بے حد کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ ضرورت اسے بدلنے کی ہے۔

افسانہ ''عباس نے کہا'' عراق پر ہونے والی جنگ میں امریکہ کی بربریت اور عراق پر اس کے پے در پے حملے کی تصاویر پیش کرتا ہے۔ جنگ کو ٹی۔وی پر ٹیلی کاسٹ کرنے کے لئے کئی ملین ڈالرز کے کنٹریکٹ ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ امریکی گورنمنٹ جنگ کے بعد عراق کی تعمیر نو سے متعلق ٹنڈر بھی طلب کر رہی ہے۔ امریکی گورنمنٹ کے مطابق: ''ان ٹھیکوں کے حق دار صرف وہی ملک ہوں گے جو عراق کو تباہ کرنے میں امریکہ کا ساتھ دیں گے۔'' امریکہ عراق میں اسلامی تہذیب و تاریخ کو مٹانا اور وہاں کے بچوں کو تعلیم سے محروم رکھنا چاہتا ہے اس لئے امریکہ عراق کی تاریخی لائبریریوں، میوزیم اور مقدس مزاروں کو آگ لگا رہا ہے۔ اس افراتفری میں ایک پیاسی عورت اپنے بیٹے عباس کو پانی کے لئے آواز دے رہی ہے۔ عباس ایک نیک لڑکا ہے جو عراق کے زخمی سپاہیوں کو پانی پلاتا ہے۔ جنگ کے دوران اس کے دونوں ہاتھ کٹ جاتے ہیں مگر اس کا حوصلہ کم نہیں ہوتا۔ افسانہ کا خاتمہ یوں ہوتا ہے:

''خون میں ڈوبا ہوا عباس لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور غصہ میں چلا کر بولا۔۔۔''بش نے ہاتھ کاٹ دیے ہیں۔۔۔مگر میں اسے لات مار سکتا ہوں۔۔۔''

''عراق یدھ کے اس آخری سماچار کے ساتھ اب ہمیں آگیا دیجیے۔۔۔نمسکار۔۔۔!''

(مجموعہ۔راستہ بند ہے۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۰ء ص ۱۷)

جیلانی بانو کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ ادبی ذوق وشوق اور صلاحیتوں کی مدد سے انھوں نے ایک ایسا پرکشش اسلوب ایجاد کیا ہے جو قاری کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ اس سیاق میں مشہور فکشن نگار کرشن چندر ایک خط (۱۹۵۸ء) میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔فنّی نزاکتوں کی آپ کے نزدیک بڑی اہمیت ہے اور اس میدان میں آپ نے بڑوں بڑوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں آپ بے حد محتاط نظر آتی ہیں اور مشاق جوہریوں اور نگینہ سازوں کی طرح عرق ریزی کرتی ہیں۔۔۔''

(دور کی آوازیں۔خطوط کا انتخاب۔جیلانی بانو۔ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۰ء ص ۴۱۶)

غرض یہ کہ اردو کے افسانوی ادب میں جیلانی بانو کو منفرد و ممتاز مقام حاصل ہے۔ وہ ایک تجربہ کار افسانہ نگار ہیں ان کا ادبی سفر سات دہائیوں کو محیط ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کے یہاں بڑی وسعت ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہمارے معاشرے میں ہونے والے ظلم و جبر اور طبقاتی کشمکش کے ساتھ سیاسی و سماجی حالات و مسائل کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے نہ صرف ہماری معاشرتی زندگی کی بدلتی ہوئی تصاویر کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں بلکہ ان میں ہندوستان کی سیاسی و سماجی زندگی سے وابستہ ایسے مختلف مسائل موجود ہیں جن کا حل سماجی فلاح و بہبود کے لئے از حد ضروری ہے۔ بہر کیف ان کے افسانے معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہیں!

☆☆☆

گورکھپور میں پہلی جنگ آزادی کے نقوش

ڈاکٹر درخشاں تاجور
بسنت پور، سوداگر محلہ، گورکھپور۔ موبائل: (7668637788)

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کے دن ہمارے ملک کو استبداد کی محکومی سے نجات ملی۔ اس کے لئے ہندوستانیوں نے طویل عرصے تک جدوجہد کی۔ گورکھپور جس کے نام کو رگھوپتی سہائے فراقؔ، منشی پریم چندؔ اور مجنوں گورکھپوری نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے شہرت کے بامِ عروج تک پہنچایا، اسے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ یہاں کے لوگوں نے جنگ آزادی کے دوران ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا ملا کر انگریزوں سے سخت مقابلہ کیا اور اس کے لئے کسی قسم کی قربانی دینے سے گریز نہیں کیا۔

آج ہم ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں شریک کچھ ایسے افراد سے متعارف کراتے ہیں جنھوں نے گورکھپور میں مشعلِ آزادی کو روشن رکھا اور اپنے نام کو تاریخ کے صفحات میں زندہ جاوید بنا دیا۔ ساتھ ہی کچھ ایسے مقامات سے بھی آپ کو روشناس کراتے ہیں جو ہماری بے توجہی سے مٹ جانے کی کگار پر ہیں اور وقت کی گرد نے جن پر اتنی دبیز چادر ڈال دی ہے کہ ہم انھیں چاہ کر بھی دیکھ نہیں پاتے۔

محمد حسن۔ ۱۸۵۷ء میں گورکھپور میں جنگ آزادی کی قیادت کی کمان محمد حسن نے سنبھالی جو پہلے اودھ کے نواب کے ناظم تھے اودھ کی ضبطی کے بعد انھیں ان کے عہدے سے معزول کر دیا گیا اس وجہ سے وہ انگریزوں سے نفرت کی آگ میں جل رہے تھے۔ بغاوت شروع ہونے کے وقت محمد حسن لکھنؤ میں تھے۔ لکھنؤ سے وہ ٹانڈہ آئے اور ٹانڈہ میں انھوں نے راجہ عباس علی سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بغاوت میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ راجہ عباس علی نے نہ صرف ان کے لئے پیسوں کا انتظام کیا بلکہ گورکھپور روانہ ہونے کے لئے کشتیوں کا انتظام بھی انھوں نے ہی کرایا۔ جب وہ گورکھپور پہونچے تو ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور انھیں ناظم کے عہدے پر سرفراز کیا گیا۔ انگریزوں نے یہاں کے رجواڑوں بانسی ستاسی، گوپال پور، مجھولی، تمکوہی کو حالانکہ یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ گورکھپور کے حالات پر نظر رکھیں لیکن ان لوگوں نے ان کے حکم کی کوئی پرواہ نہیں کی اور کسی نے محمد حسن کا راستہ نہیں روکا بلکہ ان کی زبردست مدد بھی کی۔ ڈمری کے راجہ بندھو سنگھ، رودر پور راجہ، نرہر پور کے راجہ، ستاسی کے راجہ سبھی نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ گورکھپور جیل میں محمد حسن کی رسم تاج پوشی بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ سردار علی کی کمان میں بڑی تعداد میں لوگ فوج میں شامل ہوئے محمد حسن نے گورکھپور میں غیر ملکی اشیاء کے بائیکاٹ کی مہم بھی چلائی جو بہت کامیاب رہی۔ محمد حسن کی سرگرمیوں سے انگریز اس قدر ہراساں سے ہوئے کہ انھوں نے ان کی گرفتاری کا اشتہار جاری کر دیا۔ لیکن انگریز انھیں گرفتار کرنے کے اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں کر سکے۔ انھوں نے محمد حسن کو گورکھپور سے نکالنے کے لئے نیپال سے رانا جنگ بہادر کی فوجیں بلائیں تب کہیں جا کر انھیں کامیابی ملی۔ محمد حسن گورکھپور سے فرار ہو گئے اور انگریزوں نے دوبارہ سے گورکھپور پر قبضہ حاصل کر لیا۔

سرفراز علی۔ اس مجاہد وطن کا تعلق گورکھپور کے سوداگر محلے سے تھا جو اردو بازار کے قریب واقع ہے۔ سرفراز علی ۱۸۵۷ء کے قبل سے ہی نانا صاحب کے ساتھ شریک ہو کر ملک کے مختلف حصوں میں جا کر انگریزوں کے خلاف ماحول بنا رہے تھے جس وقت بغاوت ہوئی وہ شاہجہاں پور میں تھے وہاں سے وہ بخت خاں کے ہمراہ بریلی ہوتے ہوئے دہلی پہونچے۔ بخت خاں نے انھیں امیر المجاہدین بنایا تھا۔ انھوں نے اس فتوے پر دستخط کئے تھے جسے بخت خاں نے انقلابیوں کی حمایت میں تقسیم کرایا تھا دہلی کی شکست کے بعد بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اودھ آ کر انھوں نے احمد اللہ شاہ کے ہمراہ اودھ میں ہونے والے معرکوں میں حصّہ لیا۔ اودھ کی شکست کے بعد وہ بیگم حضرت محل نانا صاحب اور دوسرے انقلابیوں کے ساتھ نیپال کی طرف نکل گئے۔ نیپال کے راجہ نے انھیں عزت و احترام کا درجہ دے کر کاٹھمانڈو میں پناہ دی۔ جنگ آزادی میں شرکت کرنا انھیں بہت مہنگا پڑا گھر والے بھی بے وطن ہوئے اور خود بھی انھوں نے غریب الوطنی کا عذاب جھیلا۔ نہایت کسمپرسی کی حالت میں کاٹھمنڈو میں ہی ان کی وفات ہوئی اور وہیں کی جامع مسجد کے ایک حصّے میں دفن ہوئے اور بہادر شاہ کی طرح اس مجاہد وطن کو بھی۔

دوگز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

آغا ابراہیم بیگ۔ آغا ابراہیم بیگ ۱۸۵۷ء میں موتی جیل میں جیلر کے عہدے پر تعینات تھے۔ انگریزوں کے ظلم اور بربریت نے انھیں بھی انگریزوں کا سخت ترین دشمن بنا دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں گورکھپور کی جیل میں بہت سے باغیوں کو قید کر کے موتی جیل میں رکھا گیا تھا۔ آغا ابراہیم بیگ نے انگریزوں کی زیادتی کا بدلہ اس طرح لیا کہ انھوں نے سارے قیدیوں کو جیل سے رہا کر دیا۔ رہا کرنے کے بعد وہ خود روپوش ہو گئے آغا ابراہیم بیگ کی بیٹی اشرف النساء بیگم کی شادی بندے علی بیگ سے ہوئی تھی بندے علی بیگ کے والد بھی انگریزوں کے سخت ترین دشمن تھے انگریزوں نے ان کی انگریز دشمنی کا بدلہ انھیں پھانسی کے پھندے پر چڑھا کر لیا۔ اشرف النساء بیگم کا امام باڑہ ان کی یاد میں شیخ پور میں بنوایا گیا تھا اور محلے کا نام بھی انھیں کے نام پر رکھا گیا تھا۔ آغا ابراہیم بیگ کے اجداد مرزا حسن علی بیگ تھے۔ یہ خاندان ۱۷۳۹ء میں ایران سے گورکھپور آ کر آباد ہوا تھا۔

بندھو سنگھ۔ بندھو سنگھ ڈمری ریاست کے راجہ تھے۔ محمد حسن کو انھوں نے بھی اپنا بھرپور تعاون دیا تھا۔ وہ انگریزوں سے گوریلا لڑائی لڑ رہے تھے۔ انگریزوں کو جب ان کے متعلق خبر ملی تو وہ انھیں گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن انھیں کسی طرح سے کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ انھوں نے ہر طرف مخبروں کا جال بچھا رکھا تھا۔ آخر کار ایک مخبر کی خبر سے انھیں ترکلہا کے جنگل میں سوتے وقت انگریزوں نے گرفتار کر لیا اور انھیں ۱۲/ اگست ۱۸۵۷ء کو علی نگر چورا ہے پر پھانسی دے دی۔ جس کی تصدیق معاصر مآخذ کشف البغاوت سے بھی ہوتی ہے۔ جسے سید احمد علی شاہ نے اسی عہد میں تحریر کیا تھا۔

> گورکھپور پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے ان کی وطن پرستی کے صلے میں ۸/ اپریل ۱۸۵۸ء کو ان کے کنبے کے دوسرے افراد کے ساتھ انھیں کے گھر میں پھانسی دے کر ان کے مکان پر قبضہ کر کے اسے منہدم کر دیا اور اس جگہ پر نخاس کوتوالی بنا دی جو آج بھی اسی جگہ پر ہے۔ ان کا مزار بھی نخاس کوتوالی میں ہی ہے۔

عنایت علی۔ عنایت علی شاہ پور اسٹیٹ کے راجہ تھے گورکھپور میں جب بغاوت کے شعلے بلند ہوئے تو سارے اعلیٰ افسران گورکھپور سے باہر تھے۔ اس وقت کلکٹر پیٹرسن اعظم گڑھ میں رہتا تھا اور وہیں سے گورکھپور کا انتظام دیکھتا تھا۔ وہ گورکھپور آنے کے لئے بے چین تھا لیکن جگدیش پور کے بابو کنور سنگھ اور ان کے بھائی امر سنگھ نے سرجوندی کے کنارے (بڑھل گنج) میں ان کا راستہ روک رکھا تھا عنایت علی سے کمانڈر ایلس نے سرجوندی پار کرنے کے لئے ناؤ کا انتظام کرنے کی درخواست کی لیکن عنایت علی کو انقلابیوں سے ہدایت مل چکی تھی کہ وہ کسی طرح انگریز افسران کو گورکھپور میں داخل نہ ہونے دیں۔ عنایت علی نے انگریزوں کو اپنی حکمت عملی سے گورکھپور میں داخل نہیں ہونے دیا۔ انگریزوں نے انھیں یہ حکم دیا تھا کہ وہ دھریا پار کے قریب نیل کی کوٹھی کی حفاظت کریں لیکن عنایت علی نے انگریزوں کے اس حکم کو بھی اس وجہ سے نظر انداز کر دیا کہ اس کوٹھی کا مالک ہندوستانیوں پر ظلم زیادتی کے پہاڑ توڑتا تھا۔ انگریزوں نے عنایت علی کو اپنا سخت ترین دشمن گردانا۔ ان کی تمام جائیداد ضبط کر کے نیلام کر دی۔ ان کی جائیداد کا کچھ حصّہ جانکی کماری نے بارہ آنے میں، ایک آنے میں شیوراج چودھری نے اور تین آنے میں ترونی لال نے لے لیا۔ شاہ عنایت علی کو انگریزوں نے پھانسی دے دی۔ ان کی لاش کو انگریزوں سے ان کے اقرباء نے لے کر دفنا دیا۔ عنایت علی کا مزار شاہ پور گاؤں میں ہے اور آج بھی انگریزوں کے ظلم وستم کی داستان سنا رہا ہے۔

سردار علی: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اپنی شجاعت اور بہادری سے انگریزی حکام کو جن افراد نے ناکوں چنے چبوائے ان میں سردار علی اور رمضان علی کا نام سر فہرست ہے۔ محمد حسن کے گورکھپور آنے پر سردار علی نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا تھا اور وہ اپنے اقرباء کے ساتھ محمد حسن کی پیشوائی کو گئے تھے۔ محمد حسن کی رسم تاجپوشی میں بھی انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ محمد حسن نے اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد فوج کی تشکیل دی تو سردار علی کو سواروں کا مالک بنایا تھا۔ سردار علی کی تحریک پر گورکھپور کے بہت سے لوگوں نے فوج میں شمولیت اختیار کر کے انگریزوں سے سخت مورچہ لیا تھا۔ نواب گوہر شمشیر علی، احسان علی، خورشید

علی، وزیرن، دلدار خاں، حسن خاں، رام پھل، غیاث الدین خاں، چھنگے خاں، محمد سعید، امداد علی، مظہر بخش، رحیم داد خاں، مخدوم بخش، فیض بخش، نرائن اور عابد علی وغیرہ وہ لوگ تھے جو سردار علی کی فوج میں شریک ہوئے تھے اور جس کی تصدیق کشف البغاوت سے ہوتی ہے۔ مشرف علی، علی حسن، جعفر علی، مرزا ہمایوں ، رمضان علی ، عبدالخالق، اللہ داد خاں، فیض علی، محمد فقیر، عالی حسن عباس علی، نونیندھ رائے، فتح علی، بلی سنگھ، مظہر علی، واحد علی، احمد خاں، ابراہیم بیگ، کلو بیگ، برج موہن، شکر اللہ، منصور علی، مدار بخش، نجف علی، وغیرہ نے بھی محمد حسن کو تعاون دیا تھا اور ان کو معاونت کرنے کی ترغیب بھی سردار علی خاں نے ہی دلائی تھی۔ سردار علی خاں اور رمضان علی خاں کی انقلابی سرگرمیوں نے انگریزوں کو سخت ہراساں کر دیا۔ گورکھپور پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے ان کی وطن پرستی کے صلے میں ۸/ اپریل ۱۸۵۸ء کو ان کے کنبے کے دوسرے افراد کے ساتھ انھیں کے گھر میں پھانسی دے کر ان کے مکان پر قبضہ کر کے اسے منہدم کر دیا اور اس جگہ پر نخاس کوتوالی بنادی جو آج بھی اسی جگہ پر ہے۔ ان کا مزار بھی نخاس کوتوالی میں ہی ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں کو انگریزوں نے پھانسی دی تھی جن میں سے کچھ کے نام تو تاریخ کے صفحات میں درج ہوئے لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جو وطن کی حرمت پر قربان تو ہوئے لیکن تاریخ میں ان کا نام بھی نہیں ملتا۔ شہر کے ہر حصّے میں انگریزوں نے پیڑوں پر لٹکا کر اہل گورکھپور کو ان کی حب الوطنی کا انعام دیا تھا۔ مشرف علی کو علی نگر میں پھانسی دی گئی۔ رسول علی، اولاد علی، نونیندھ رائے، واحد علی، بسنت ناتھ، لعل خاں، خیرات علی، شیخ فیضو، ولی داد خاں، کریم داد خاں، عنایت علی اور حیدر حسین وغیرہ اس شہر کے وہ بہادر سپوت تھے جنھیں پھانسی دئے جانے کی خبر ہمیں اس عہد کے معاصر تصنیف کشف البغاوت کے ذریعے ملتی ہے۔ اسی کتاب سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خیرات علی نام کے ایک شخص کو انگریزوں نے دس سال قید کی سزا دی تھی۔ ہر سال یوم آزادی کے موقع پر ہم ایک رٹا رٹایا شعر ضرور پڑھتے ہیں ۔

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مرنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

وطن کی آبرو کے تحفظ کے لئے اپنی جان اور مال کو قربان کرنے والوں کی یادگاروں کے تحفظ کے لئے ہم نے کیا قدم اٹھائے ہیں اس پر گفتگو تو ہوتی ہے اور دعوے بھی کئے جاتے ہیں لیکن نتیجہ ہمیشہ صفر ہی ہوتا ہے۔ کم از کم ہم اپنی نئی نسلوں کو اپنے وطن کی آن بان اور شان پر نثار ہونے والے شہیدانِ وطن کے ناموں سے آگاہ تو کر سکتے ہیں اور ہمیں ایسا کرنا بھی چاہئے کیونکہ ہماری تاریخ کے یہ وہ زریں اوراق ہیں جنھیں آب زر سے لکھا جانا چاہئے تھا لیکن افسوس ہے ایسا نہیں ہوا اور ہم نے ان مجاہدین آزادی کی قربانیوں کو یکسر فراموش کر دیا۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ۔

اپنی تاریخ کو جو قوم بھلا دیتی ہے
صفحۂ دہر سے وہ خود کو مٹا دیتی ہے

گورکھپور میں جنگ آزادی کے نقوش کے مختصر تعارف

(۱) **موتی جیل** : بائی پاس سے سٹے سوداگر محلے کے پیچھے لال ڈگی سب اسٹیشن کے سامنے مغلیہ افواج کے قلعے سے ملحق جیل جہاں پہلی جنگ آزادی میں شامل وطن پرستوں کو قید کیا جاتا تھا۔

(۲) ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کا گواہ وہ پیڑ جو سوداگر محلے کے قریب ہے اور جس پر انگریزوں نے تقریباً ۳۰۰/سو افراد کو پھانسی دی تھی جس میں سوداگر محلے کے بھی بہت سے لوگ شامل تھے ۔(بشکریہ مکہ معظّمہ سے معظم آباد تک از۔ مجاہد الاحسن)

(۳) **گنج شہیدان** : سوداگر محلے کے خاندانی قبرستان کی وہ دو اجتماعی قبریں جنھیں گنج شہیداں کہا جاتا ہے اور جن میں جگہ کی تنگی کے سبب بہت سے لوگوں کو ایک ساتھ دفن کیا گیا۔ بشکریہ مکہ معظّمہ سے معظم آباد تک از۔ مجاہد الاحسن۔

(۴) علی نگر میں واقع برگد کا پیڑ جس پر بہت سے شہیدانِ وطن کو پھانسی دی گئی۔

(۵) سرفراز علی کا مزار (کاٹھمنڈو جامع مسجد کے ایک حصّے میں)

(۶) عنایت علی شاہ کا مزار (شاہ پور گورکھپور)

(۷) سردار علی خاں کا مزار (نخاس کوتوالی گورکھپور)

(۸) ترکلہا مندر میں بندھو سنگھ کی یاد میں بنائی ہوئی عمارت یہ مندر گورکھپور سے ۲۰/کلومیٹر اور چوری چورا سے ۵/کلومیٹر کی دوری پر ہے۔

☆☆☆

مزاحیہ شاعری کا باوقار شاعر-ساغرؔ خیامی

ڈاکٹر نزہت زہرا
(صدر شعبۂ اردو، سریندر ناتھ کالج فار وومین، کولکاتا)

ساغرؔ خیامی مزاحیہ شاعری کا ایک ایسا نام ہے جنہیں بیسویں صدی میں اردو طنز و مزاح کا آخری ستون کہا جائے تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا۔ وہ لکھنوی زبان وتہذیب کے ان آخری ٹمٹماتے ہوئے چراغوں میں سے ایک تھے جن کی شاعری میں ہمیں لکھنوی لب ولہجہ، شیریں زبان اور اودھ کی تہذیبی روایات اور اقدار کی جھلک ملتی ہے۔

ساغرؔ خیامی نے لکھنو کے اس مشہور و معروف خانوادے میں آنکھ کھولی جس نے عالی مرتبت علماء اور یکتائے زمانہ شعرا سے دنیائے علم وادب کو روشناس کروایا ہے انہیں اپنی شاعری کے لئے کسی تلمیذ یا اصلاح کی ضرورت کبھی نہیں ہوئی کیونکہ شاعری ان کو وراثت میں ملی تھی۔ دادا عبل ہند حضرت ذاخرؔ لکھنوی جن کو نوحوں کا موجد کہا جاتا ہے، والد اولاد حسین صاحب شاعرؔ جو ایک ہی وقت میں ادیب، خطیب، صحافی، مورخ اور بے مثال شاعر تھے۔ شاعری میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی وقت اور ایک ہی طرح میں سولہ شاگردوں کو سولہ الگ الگ غزلیں لکھوا دینا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ چچا مشہور نوحہ گو علامہ فضل نقوی بڑے بھائیوں میں مہدی نظمیؔ، شمس الحسن تاجؔ، شہریار حسین عزمیؔ اور ناظر خیامی جیسی نامور ہستیاں ہیں۔ جن کی خدمات سے ادب و ہنر کا خزانہ آج بھی معمور ہے اپنی خاندانی روایت کے مطابق ساغرؔ خیامی نے بھی کم عمری میں ہی شاعری کرنا شروع کر دی اور جوہر تخلص کے ساتھ سنجیدہ شاعری کرنے لگے۔

1979ء میں ان کی زندگی کا ایک بڑا سانحہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کا رخ مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا۔ ان کے بڑے بھائی ناظرؔ خیامی اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے انتقال نے طنز و مزاح کی معیاری شاعری میں ایک ایسا خلاء پیدا کر دیا جس کو پُر کرنا کسی بھی شاعر کے بس کی بات نہیں لہٰذا اس خلا کو پُر کرنے اور اپنے بھائی کی چھوڑی ہوئی روایت کو آگے بڑھانے کے ارادے سے انہوں نے اپنے بھائی کے ہی وزن پر اپنا تخلص بدل کر ساغرؔ خیامی رکھ لیا۔ شاعری میں طنز و مزاح کا رنگ اور ادائیگی کا انداز چوں کہ ناظرؔ خیامی سے مشابہ تھا اس لیے مقبولیت میں دیر نہیں لگی۔ ساغرؔ خیامی کی مزاحیہ شاعری میں یوں اچانک آمد کے متعلق فاروق ارگلی اپنی کتاب ''دیوارِ قہقہہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہمارے دور کے مقبول مزاحیہ شعراء میں رضا نقوی واہیؔ اور دلاور فگار کے بعد جس ہمہ گیر مزاحیہ شاعر کو سرفہرست رکھا جا سکتا ہے وہ ہیں سید رشید الحسن ساغرؔ خیامی۔ جس کے بارے میں یہ کہنا ہرگز مبالغہ یا جانب داری نہیں کہ انہوں نے اردو کی بزم شعر و سخن میں اچانک نمودار ہو کر ''بہت سے'' ہی نہیں تقریباً سارے چراغ گل کر دیے۔ پھکڑ پن، عامیانہ بازاری انداز، مزاحیہ نام اور تخلص اختیار کر کے جوکروں اور مسخروں جیسی حرکتیں کر کے مشاعروں میں رنگ جمانے والوں کا بازار مندا ہو گیا اور اردو زبان میں ایک شائستہ، پروقار اور پرشکوہ لہجے میں پورے فنی اور لسانی طمطراق کے ساتھ قہقہوں کی بارش کرنے والا ساغر خیامی اپنے عہد کی طنزیہ مزاحیہ شاعری کا سرخیل بن کر ابھرا اور بین الاقوامی شہرت، قبولیت اور قدر و منزلت نے اس کے قدم چومے۔''

(دیوار قہقہہ از فاروق ارگلی، ص:408، ایم آر پبلی کیشنز)

1980ء میں پہلی بار لال قلعے میں اپنا کلام سنایا تو لوگ حیران رہ گئے کہ طنز و مزاح کا یہ عظیم شاعر اب تک کہاں پوشیدہ تھا:

ہے تعلق کبیرؔ کے گھر سے
رشتہ رکھتے ہیں میرؔ کے گھر سے
ڈاکہ غالبؔ کے گھر پڑا ساغرؔ
مال نکلا بشیرؔ کے گھر سے

ساغرؔ خیامی طنز ومزاح کے میدان کے شہسوار ہیں۔ انہوں نے خود زندگی کے ہر نشیب وفراز کو جھیلا تھا اس لیے زندگی کے ہر شعبے میں ان کا مشاہدہ زبردست تھا۔ انہوں نے اپنی مزاحیہ شاعری میں زندگی اور سماج کے تقریباً ہر گوشے کو موضوع بنایا ہے ان کی ہر نظم اور ہر قطعے میں حقیقت کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں بلند آہنگی، روانی اور بے ساختگی ہے۔ لفظوں کے انتخاب میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ غزل کی روایتی زبان میں مزاحیہ شاعری کرتے ہیں اس لئے ان کے یہاں شاعری کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات کا مطالعہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ سماج میں پنپنے والی برائیوں، جدید دور میں نیشن پرستی کی وبا، نوجوانوں میں تہذیبی قدروں کا زوال، مذہبی قائدین کی ریاکاری، گندی سیاست کی کرم فرمائیاں، بدعنوانی، ملاوٹ اور مشینی دور کے انسانوں میں خلوص اور محبت کے جذبے کا فقدان، عوام کی پریشانیاں، افلاس اور تنگ دستی کے باوجود کنبے میں بچوں کی کثرت وغیرہ جیسے عام اور سلگتے ہوئے مسائل کو انہوں نے اپنی شاعری کا نشانہ بنایا ہے۔ ''گھوڑے کی لید''، ''ورلڈ کپ کرکٹ''، ''الٹی گنگا''، ''ٹی سی''، ''پاگل خانے میں''، ''اکیسویں صدی کا آدمی''، ''دلی سے کانپور تک''، ''فلمی بھوت''، ''غالب دلّی میں''، ''دلّی کی بسیں''، ''بجلی گزر گئی وغیرہ ان کی بہترین نظمیں ہیں جن میں ساغر کا فن اپنے عروج پر ہے۔

نظم ''فیشن کا ستم'' کا ایک بند ملاحظہ ہو جس میں فیشن کے دیوانوں کا حال پیش کیا گیا ہے:

آپ کے پیار میں کہسار بھی توڑے ہم نے
سر بھی قدموں پہ رکھے ہاتھ بھی جوڑے ہم نے
پیچھے دلت کے بھی دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے
آپ کے کہنے سے ماں باپ بھی چھوڑے ہم نے
ڈھونڈنے جائیں چراغِ رخ زیبا لے کر
ہم سے الو نہ ملیں گے کہیں پیسہ دے کر

اشیائے خوردنی میں ملاوٹ ہندوستانی سماج کا سنگین مسئلہ ہے اس مسئلے سے شاعر بھی دوچار ہے لہٰذا انہوں نے اس برائی پر بعنوان ''ملاوٹ'' جو نظم لکھی وہ پڑھنے کے لائق ہے:

اشیائے خوردنی میں جو شدت ہے میل کی
تعداد بڑھ رہی ہے یونہی پارٹ فیل کی
تلہن سے بو نکلتی ہے مٹی کے تیل کی
گھر کی خراب روٹیاں اچھی ہیں جیل کی
پٹرول سونگھ سونگھ کے اسمارٹ ہو گیا
کک مارنے سے آرمی اسٹارٹ ہو گیا

ساغرؔ خیامی سماج کے مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں ان کی اپنی نظر اور اپنا نظریہ ہے۔ وہ اپنے دور کے اسباب کا ادراک رکھتے ہیں اور ان مسائل کی نشان دہی اپنی نظموں میں کر دیتے ہیں تاکہ معاشرہ ان برائیوں اور مسائل کے حل کے لیے اقدامات کرے۔ بشیر بدرؔ ان کی شاعری کی اسی خصوصیت سے متعلق لکھتے ہیں:

''ساغرؔ خیامی کی شاعری کا مطالعہ یہ بات ثابت کرتا ہے کہ ساغرؔ خیامی نظر اور نظریہ دونوں رکھتے ہیں لیکن وہ نظریے کو جس فن کارانہ اور شاعرانہ بصیرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں وہی ان کے اچھے شاعر اور فن کار ہونے کی دلیل ہے ان کی نظمیں کردار نگاری اور مرقع نگاری کا اچھا نمونہ ہوتی ہیں۔ وہ ایک ماہر داستان گویا افسانہ نگار کی طرح اپنے کردار کی ساری کمزوریوں اور مجبوریوں کو دلچسپ انداز میں سجاتے ہیں۔''

(نظر اور نظریہ از بشیر بدرؔ مشمولہ پس روشنی: ساغرؔ خیامی، ص:18)

ساغرؔ خیامی کی نظمیہ شاعری طنز ومزاح کا ایک گلشن ہے جس میں مختلف رنگ اور خوشبو کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ان میں طنز کے خار بھی ہیں مگر مزاح کی پنکھڑیوں کی نزاکت اور رنگ ذہن ودل کو سرشار اور معطر کر دیتی ہے، لیکن ان کے گلشن شاعری میں مزاح کے پھول زیادہ ہیں، طنز کے خار کم ہیں۔ وہ زبان کی صحت، شاعرانہ نفاست اور لطافت اور موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے ایک مکمل ظریف شاعر ہیں۔ ان کے فن کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے ان موضوعات کو بھی موضوع بحث بنایا جس کو شاعری کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کرکٹ جیسے خشک موضوع کو پہلی دفعہ ساغرؔ نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور اس میں اپنے فن کے جوہر اس طرح دکھائے کہ ان کو پڑھ کر ان لوگوں کو بھی کرکٹ سے دلچسپی پیدا ہوگئی جو پہلے کرکٹ سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

انہوں نے ''ورلڈ کپ کرکٹ''، ''کرکٹ میچ''، ''ون ڈے''، اور ''چوکے لگایئے'' کے عنوان سے چار دلچسپ

نظمیں لکھیں۔ان موضوع کو کامیابی سے برتنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ خود ساغر خیامی کو کرکٹ سے بہت دلچسپی تھی اور وہ کرکٹ میچ میں بحیثیت فاسٹ بالر بہت مشہور تھے۔نظم ''کرکٹ میچ'' میں شاعر کا اندازِ بیان رومانی ہے اور منظر کشی کا فن اپنے عروج پر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دوشیزہ کے ہاتھ میں جب لال گیند آتا ہے تو وہ گیند بلے باز کو گلاب کا پھول نظر آتا ہے اور اسے یہ گمان ہوتا ہے کہ گویا وہ حسینہ گیند بازی نہیں بلکہ اسے شراب پلا رہی ہے۔اس تصور کو انہوں نے بڑے ہی خوب صورت انداز میں مترنم الفاظ کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔وہ کہتے ہیں:

وہ لال گیند پھول ہو جیسے گلاب کا
جس طرح دستِ ناز میں ساغر شراب کا
سایہ ہوا میں ناچتا تھا آفتاب کا
بمپر میں سارا زور تھا حسن و شباب کا
ایسے بھی اپنے عشق کا میداں بناتے تھے
امپائر ہر اپیل پر انگلی اٹھاتے تھے

ساغر خیامی کو صرف طنز و مزاح کی شاعری میں ہی کمال حاصل نہیں تھا دراصل وہ فطرتاً بذلہ سنج تھے اور اسی مزاحیہ فطرت کو انہوں نے اپنی شاعری کے سانچے میں بہت خوب صورتی سے ڈھالا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مزاحیہ شاعری کے پہلے ہی سال یعنی 1980ء میں وہ پورے طمطراق کے ساتھ مزاحیہ شاعر میدان میں آ گئے اور ''تلاش مکان''، ''تھانے دار''، ''نوادرات کی دکان''، ''ٹمپر یری جاب''، ''ڈی ٹی سی''، ''گریہ شیطان'' اور ''غالب دلّی میں'' جیسی شاہکار نظمیں سامعین کی سماعت کی نذر کیں۔''غالبؔ دلّی میں'' ان کی ایک کامیاب طنزیہ و مزاحیہ نظم ہے۔اس نظم میں وہ سماج کے اس رویے پر طنز کرتے ہیں کہ وہ شاعر و ادیب کی قدر اس کی زندگی میں نہیں کرتے اور بعد مرگ وہ اس کی یاد میں یادگار قائم کرتا ہے اور اس کے فن پر کتابیں لکھتا ہے۔ اس نظم میں وہ غالبؔ کی زندگی میں ان کی ناقدری اور مرنے کے بعد ان کی قدردانی پر سماج پر طنز کرتے ہیں۔ اس نظم میں غالب مرنے کے بعد دنیا میں اپنی اس قدر دانی پر رشک کرتے ہیں۔اپنے نام پر اکاڈمی اور ایوان قائم کیے جانے پر فخر کرتے ہیں اور تمنا کرتے ہیں کہ وہ دوبارہ دنیا میں بھیج دیئے جائیں۔خدا ان کی خواہش کو قبول کرتے ہوئے انہیں دوبارہ کچھ دنوں کے لیے دنیا میں بھیج دیتا ہے مگر جب وہ دنیا میں دوبارہ آتے ہیں تو لوگ انہیں پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ یہاں کے بدلے ہوئے طور طریقوں سے مایوس ہوجاتے ہیں اور واپس جنت میں چلے جاتے ہیں اور خدا سے دنیا والوں کی شکایت کرتے ہیں۔ان تمام فرضی واقعات کی ساغر خیامی نے جس حسن خوبی اور کامیابی کے ساتھ لکھنوی لب ولہجہ کی چاشنی میں لپیٹ کر منظر کشی کی ہے یہ انہیں کا حصہ ہے۔کہتے ہیں:

غالبؔ نے کی یہ عرض خداوند ذوالجلال
جنت سے کچھ دنوں کے لیے کر مجھے بحال
مہ وش مرے کلام کو سازوں پہ گائے ہیں
قسمت نے بعد مرنے کے کیا دن دکھائے ہیں
شاعر جو منحرف تھے وہ مرعوب ہو گئے
ایوان جو میرے نام سے منسوب ہو گئے
خادم کا اس ادارے سے رشتہ ہے باہمی
اک بار میں بھی دیکھ لوں غالبؔ اکاڈمی

دنیا میں مایوسی ہاتھ لگنے کے بعد غالبؔ اپنے پروردگار سے شکایت کرتے ہیں:

جینا زمانے والوں نے دشوار کر دیا
پہچاننے سے بھی مرے انکار کر دیا
آئی صدائے حق کہ یہی بندوبست ہیں
تیرے وطن کے لوگ تو مردہ پرست ہیں

ساغرؔ خیامی بسیار نویس ہیں ان کے تخیل کی پرواز بہت بلند ہے انہیں طویل نظمیں لکھنے میں مہارت حاصل ہے۔طویل نظمیں لکھنا اور اس میں شروع سے آخر تک دلچسپی اور تجسس برقرار رکھنا صرف ساغر خیامی جیسا باکمال شاعر کے ہی بس کی بات ہے۔ان کی نظموں میں جو کلاسیکی شاعری کی لطافت، دل کشی اور کشش ہے ان کی مزاحیہ شاعری کو وقار اور بلندی عطا کرتی ہے۔ان کے لفظیات، تراکیب اور لفظوں کا رکھ رکھاؤ ان کو مزاح نگاروں میں منفرد مقام عطا کرتے ہیں۔

ساغرؔ خیامی کی نظموں میں جس طرح انسان اور معاشرے کی خامیوں کو مزاح اور طنز کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی انسان اور کائنات کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو سنجیدگی اور متانت سے بھرے لہجے اور اسلوب میں پیش کیا ہے۔ان کی غزلوں میں ان کا مختلف روپ اور رنگ سامنے آتا ہے۔ مزاحیہ نظموں میں ان کا مقصد قارئین اور سامعین کو ہنسانا اور ان کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح کرنا

ہوتا ہے۔اس لیے وہ واقعات اور اشیاء کی ظاہری صداقتوں اور انسانی معاشے کی حماقتوں کو نشانہ بناتے ہیں مگر غزلوں میں وہ باطن کے منظر نامے کو اشعار کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ غزل کے روایتی سانچوں کو نہ توڑتے اور نہ ہی اظہار کے پیمانوں کو بدلتے ہیں۔ وہ غزلوں میں تغزل کو برقرار رکھتے ہوئے طرزِ اظہار میں جدت اور انفرادیت پیدا کرتے ہیں۔ وہ غزلوں میں ایک کہنہ مشق اور کلاسیکی روایات کے پرستار کی حیثیت سے ابھر کر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں غزل کے ارتقائی سفر کے تمام ادوار کے نقوش ملتے ہیں اور غزل کے عظیم شاعروں کے لہجے کی بازگشت بھی ان کی غزلوں میں سنائی دیتی ہے۔ ذیل میں اردو کے مشہور شاعروں کے رنگ میں ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

فیض کے رنگ میں:

زنداں میں خامشی ہے کوئی بولتا نہیں
حد ہو گئی کہ شورِ سلاسل نہیں رہا

غالبؔ کے رنگ میں:

یہ خار وحسن یہ گل و برگ یہ نمو کیا ہے
فریب چشمِ نظارہ ہے رنگ و بو کیا ہے

فراقؔ کے رنگ میں:

رگوں میں دوڑنے پھرنے سے ہم نہیں عاجز
بنے جو باعث رسوائی وہ لہو کیا ہے

ساغرؔ خیامی کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ و آہنگ کے ساتھ ساتھ جدید غزلوں کا رنگ بھی ملتا ہے۔ جدید غزلوں میں عصری آگہی، دروں بینی اور علامتی اور ایمائی انداز بیان پایا جاتا ہے ساغرؔ کے یہاں بھی جدید غزلوں کی وہی خصوصیات ملتی ہیں۔ پتھر اور شیشے کو انہوں نے معنی ومفہوم میں استعمال کر کے غزل میں جدت پیدا کی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ شخص لے لے جو نکلا تھا جسم شیشے کا
وہ شہرِ سنگ سے بچ کر کدھر گیا ہوگا

پتھر کی تو راہیں ہیں شیشے کے قدم یارو
رکھیں گے کہاں تک ہم پرکھوں کا بھرم یارو

ساغرؔ خیامی قطعات کے بھی ایک منجھے ہوئے فن کار ہیں اور طنزیہ ومزاحیہ موضوعات اور خیالات کو اپنے قطعات میں بڑی سادگی اور فن کاری سے پیش کر دیتے ہیں۔ انہوں نے ساڑھے تین سو سے زائد قطعات کہے ہیں جو ان کی ذہانت اور شاعرانہ صلاحیتوں کا بین ثبوت ہیں۔ وہ قطعات کو بھی ایک باقاعدہ صنف کی حیثیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اتنی بڑی تعداد میں قطعات کہے ہیں۔ یہ صنف ایسی ہے جس میں دو اشعار میں کوئی خیال یا موضوع پیش کیا جاتا ہے لہٰذا قادر الکلام شاعر قطعات میں بھی دریا یا کوزے بند کرنے کا کام لیتے ہیں:

میں کس کو دفن کروں کس کو پھونکنے جاؤں
رہی سہی میری جاں بھی نکال دیتا ہے
اندھیرے منہ کوئی اخبار بیچنے والا
ہزار لاشیں مرے در پہ ڈال دیتا ہے

پڑھ رہی تھیں ایک دن تسبیح بی بی بے نظیر
میں نے پوچھا کر رہی ہیں ان دنوں کوئی عمل
ہنس کے بولیں آیت الکرسی کو کر کے مختصر
کرسی کرسی، کرسی کرسی پڑھ رہی ہوں آج کل

ساغرؔ خیامی کی ظریفانہ شاعری کی ان ہی خصوصیات کی بنا پر ناقدین ادب نے انہیں اردو کے بڑے طنز ومزاح نگاروں میں شمار کیا اور انہیں دلاور فگار کے بعد اردو کی ظریفانہ شاعری کا ایک نمایاں اور ممتاز شاعر قرار دیا ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اقرار کرتے ہوئے ڈاکٹر بلال نقوی (کراچی) کہتے ہیں:

''مزاح نگار شاعر عموماً جہاں مار کھا جاتے ہیں وہ زبان کی منزل ہے۔ اس طرز کی شاعری میں نظمیت، ابتذال، پستی اور ہلکا پن پیدا ہو جانے کا امکان زیادہ رہتا ہے۔ اپنے معاصرین کے مقابلے میں ساغرؔ خیامی اس میدان میں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ انہیں یہ ہنر ان کے خاندان کے علمی پس منظر نے دیا ہے۔ الفاظ کو مضحکہ خیز سچویشن میں لاکر ان میں زبان کے بناؤ کو قائم رکھنا اور بناؤ سنگار میں شاعری کو ہاتھ سے نہ جانے دینا ان کے ہنرمند ہونے کی دلیل ہے۔''

(اکیسویں صدی کے پس منظر میں'' از ڈاکٹر بلال نقوی، مشمولہ ساغر خیامی اور ان کی ظرافتی شاعری،

ص:120، اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ)

ساغرؔ خیامی بیسویں صدی کے ایک عظیم مزاح نگار شاعر تھے وہ اپنی ظریفانہ شاعری کے لیے اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

☆☆☆

امانت اللہ اسیرؔ کی شاعری کے فنی رموز و نکات

ڈاکٹر محمد الیاس قاسمی تائب خیرآبادی
خیرآباد (یوپی) (موبائل: 9369404467)

بہت کم شعراء ہوں گے جنہیں ایک ہی وقت میں اردو ادب کی تمام اصنافِ سخن میں شعر گوئی کا ملکہ حاصل ہو۔ استاد امانت اللہ اسیرؔ ان چند شعراء میں تھے جن کو غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ، حمد، نعت، منقبت، مناجات، سہرا، رخصتی اور تاریخ گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ انگریزی نظموں کے منظوم تراجم بھی ہمیں ان کے مجموعۂ کلام ''صدائے عرش گیر'' میں دیکھنے کو ملتے ہیں، یہ جہاں ان کے قادر الکلام شاعر ہونے کا بیّن ثبوت ہے وہیں ان کے تبحر علم وفن اور ہر صنفِ سخن پر ان کی مساویانہ دسترس کا بھی گواہ ہے۔ ہر صنفِ سخن میں مشاق ہونا ایک بات ہے لیکن مخصوص صنفِ کے فنّی تقاضوں کو پورا کرنا الگ بات ہے۔ اسیر نے جس طرح سے فنی التزامات کو برتا ہے، وہ ان کے ممتاز اور باکمال ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ایسے شعراء بھی شاذ و نادر ملیں گے، جنہوں نے عروض وقواعد کی مکمل پابندی کرتے ہوئے شیریں کلامی، غنائیت اور فنّی خلوص کا لحاظ رکھا ہو، اسی لئے ایک وقت میں استاد ہونا اور شاعر بھی ہونا بہت مشکل ہے۔ عروض وقواعد کے میدان مین فنّی کسرت کرنا اور شاعری کرنا دونوں الگ الگ باتیں ہیں، بحور و اوزان کی سختی سے پابندی کرنے والے ناسخؔ کی طرح بے مثل استاد تو بن جاتے ہیں لیکن شاعر ہوتے ہوتے رہ جاتے ہیں۔ اسیرؔ نے تمام تر عروضی شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے سب ہی اصنافِ سخن میں نہ صرف یہ کہ طبع آزمائی کی ہے بل کہ شعری جمال اور فنّی کمال کا مکمل خیال بھی رکھا ہے۔

کوئی بھی ادب وقت کے تقاضوں سے بے نیاز، عصری آگہی سے بیگانہ اور جدلیاتی، تاریخی اور سماجی تغیر وتبدل سے منھ نہیں موڑ سکتا، اسیرؔ کی شاعری جو گذشتہ سات دہائیوں پر محیط ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات واقدار سے نہ صرف یہ کہ روشناس ہے بلکہ اس کو انگیز کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے باوجود اس کے کہ زندگی کی تلخیوں نے ان کی فطری ترش مزاجی میں بے حد کرواہٹ پیدا کردی ہے پھر بھی زندگی کو انہوں نے محبوب کی طرح چاہا اور جیا یہاں تک کہ زندگی اور خود کے درمیان معرکہ آرائی میں فتح انھیں کو ملی۔ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں کڑواہٹ کا کہیں احساس نہیں ہوتا۔ عام طور پر ادبِ لطیف کے علمبردار اخترؔ شیرانی کی طرح تخیّل پرستی کے قائل اور حقائقِ زندگی سے فراریت کے حامی نظر آتے ہیں۔ وہ ادب میں زندگی کی تخیّلی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں کہ عقل وادراک اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہاں زندگی سے فراریت، کم ہمتی اور جرأتِ مردانہ کی کمی کا احساس ہوتا ہے لیکن اسیرؔ کے یہاں ایسا کچھ نظر نہیں آتا، شجاعت و بیباکی اور زندگی سے آنکھیں ملانے کی جرأت ان کی غزلیہ شاعری میں بالعموم اور نظمیہ شاعری اور قطعات میں خاص طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں اس نوع کے چند اشعار:

سخن وری میں گزاری تمام شب ہم نے
غمِ فراق کو دلہن بنا کے چھوڑ دیا

اندھیرے آپ ہی گھبرا کے خود کشی کرلیں
میں اپنی قوّتِ بازو سے وہ سحر مانگوں

ملنے نہ پائیں جرأتِ پرواز کے قدم
چاہے تمہاری پرواز کانپ اٹھے

پہونچا دیا ہے مجھ کو اناالحق نے دار پر
نکلی زباں سے بات تو سر تک پہونچ گئی

غلط ہے سر جھکے دنیائے رنگ وبو کے لئے
ضمیر بیچ دوں کیا میں اپنی آرزو کے لئے

نہ چھیڑ بہرِ خدا ناتواں سمجھ کے مجھے
میں اپنی جان بھی دے دوں گا آبرو کے لئے
مری غیرت پہ جب حرف آرہا ہو
میں خود ہی توڑ دیتا ہوں سہارے

اسیرؔ کی نظموں میں رومانیت اور انقلاب کے خواب، سازِ عشق کی لے پر آزادیٔ وطن کے لئے مر مٹنے کا جذبہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ معشوق اور اس کی محبت زندگی میں رنگ بھرنے کی حیثیت تو رکھتی ہے ساتھ ہی حیات کے مختلف پہلوؤں کے لئے ولولہ اور جوش کا سبب بھی بن سکتی ہے لیکن زندگی جیسی عظیم اور انمول شئ حسن وعشق کے لئے قربان نہیں کی جاسکتی۔ اسیرؔ کے کلام میں مجازؔ کی طرح رومانیت میں انقلاب ضرور پوشیدہ ہے لیکن ان کی طرح للکار نہیں، نہ ہی فیضؔ کی سی دھیمی اور مدھم لے نہ جوشؔ کی طرح انقلاب زندہ باد کے نعرے۔ اسیرؔ کے کلام میں الفاظ کی شان وشوکت ہے مگر جوشؔ کی طرح خطیبانہ رنگ وآہنگ نہیں، مجازؔ کی طرح عشق کے سوز وساز اور درد وکرب کو سینے سے لگا کر مرجانے کا ولولہ بھی نہیں ہے بلکہ اس درد وکرب اور سوز وساز کا احساس رکھتے ہوئے زندہ رہنے کا حوصلہ اور جوش ہے، باوجود اس کے ان کے عشق میں والہانہ پن اور خود سپردگی ہے لیکن وہ حسن و عشق سے زیادہ زندگی کے تقاضوں اور عصری ضرورتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔

وطن عزیز کی خاطر جان کی قربانی دینا، ارمانوں بھرے رومان کا خون کرنا، ان کا جذباتی دعویٰ نہیں، بلکہ سوچا سمجھا فیصلہ ہے۔ زندگی کے عظیم مقصد کے حصول کے لئے انہیں کارواں بنانے کی ضرورت نہیں، وہ تنِ تنہا شمشیر برہنہ ہوکر معرکہ آرائی میں اتر آتے ہیں، انہیں سماجی حقائق ومعاشرتی آلام کا گہرا احساس ہے، جسے وہ اشعار میں بیان کرتے ہیں:

تم کو دیکھوں کہ جفا کاریٔ شاہی دیکھوں
تم کو دیکھوں کہ غریبوں کی تباہی دیکھوں
غم اگر زہر ہے اس زہر کو پینے دو مجھے
تم چلی جاؤ بس اب چین سے جینے دو مجھے
مزدور کا جو خون پئیں ان کو مٹادوں
جو ان کو جلاتے ہیں میں گھر ان کا جلادوں
ٹھوکر سے جہاں مکر کے بندوں کا اڑادوں
سرمایہ پرستی کو تہِ خاک سلادوں
شمشیر بکف آؤں گا میداں میں نکل کر
دم لوں گا میں مزدور کی تقدیر بدل کر

ترقی پسندی سے جڑے ہوئے شعراء کے یہاں خطیبانہ کرختگی، زبان وبیان کی گھن گرج ملتی ہے، اسیرؔ کی شاعری میں موضوعی اعتبار سے بھلے ہی تنوع نہ ہو لیکن ترقی پسندی سے متعلق مختصر موضوعات میں جامعیت اور گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں، زہریٰ، عذریٰ، شہناز اور ناہید میں انسانی درد کے علاوہ وطن دوستی اور جد وجہد آزادی کا جذبہ ڈرامائی انداز میں ملتا ہے، ایک رومانی کیفیت کا دلکش و دلنشیں انداز سے گریز اختیار کرتے ہوئے اصل موضوع کی جانب آنا کوئی نئی بات نہیں، ان کے یہاں ہیئتی یا تکنیکی تجربات نہیں بل کہ مشروط اور پابند نظموں میں موضوعی تجربات ہیں۔ نظموں میں ڈرامائی عنصر اقبالؔ کے ذریعہ پہلے ہی داخل ہو چکا تھا لیکن نظموں میں رومانی، بہاریہ، اور کیف ومستی میں ڈوبی ہوئی فضا سے اچانک گریز اختیار کرتے ہوئے اصل موضوع کی طرف مڑنا ان کا فنی تجربہ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ نظم کے لب ولہجہ میں تشبیب سے گریز کرتے ہوئے مدعا کی طرف آنا قصیدہ کی فارم کی صحت مند وتوانا شکل ہے۔

ہائے اس غم سے فراغت نہ تمہیں ہے نہ مجھے
عیش وعشرت کی اجازت نہ تمہیں ہے نہ مجھے
آج کل ذہن ہے ماؤف پریشاں ہے دماغ
کچھ دنوں کے لئے گل کر دو محبت کا چراغ
چین کی جنگ میں ناموس وطن کی خاطر
تم مرے خون کی مہندی جو لگا سکتی ہو
اپنے ہتھیار اٹھا لو مرے ہمراہ چلو
ورنہ جی چاہے جہاں شوق سے جاسکتی ہو
اب تو مل کر ہی بدلنا ہے زمانہ کا چلن
باندھ دو اپنے دوپٹے کا مرے سر سے کفن

اسیر کے یہاں غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کے باوجود ناہمواری کا احساس نہیں ہوتا بل کہ ہم آہنگی، نرمی اور دلنشینی ملتی ہے۔ کامیاب اور پُر اثر شاعری کے لئے مثبت عناصر میں فن اور شخصیت میں ہم آہنگی اظہار کا حسن معنویت وغیرہ کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ اظہار کے حسن کے لئے رمز وایماء کنایہ و اشارہ نادر تشبیہات واستعارات نہ صرف ان کی غزلیہ شاعری کو اعتبار بخشتی ہے بلکہ ان کی نظموں میں بھی یہ خوبیاں موجود ہیں اس طرح، معنوی اور موضوعی اعتبار سے اپنے نجی تجربات اور عصریت سے جڑ کر ان کی نظمیہ شاعری بڑی بن جاتی ہے۔

ادب وشاعری کے لئے جو تخلیقی ریاض، خلّاقانہ ذہنیت اور فنّی خلوص چاہئے وہ اسیرؔ کے کلام سے ظاہر ہے، فن اور شخصیت میں ہم آہنگی کا مفروضہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔ ادب میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن کے یہاں فن اور شخصیت میں تضادات ملتے ہیں اور یہ تضاد کسی حد تک اسیرؔ کے یہاں بھی موجود ہے۔

ان کے یہاں زندگی اور ادب کا واضح تصور ملتا ہے ان کے یہاں شعور زندگی کے ساتھ ساتھ شعورِ فن بھی ہے، انہوں نے اپنی شاعری میں مسائل اٹھا کر چھوڑ نہیں دیئے بلکہ علم وعقل کی روشنی میں ان کا حل بھی پیش کیا ہے اس لئے کلام میں نہ دھندھلا پن ہے نہ کوئی اشکال اور ابہام ملتا ہے، نہ ہی فرسودگی اور سوقیانہ انداز دکھائی دیتا ہے، حسن اور جسم حسن کی دلکشی ومستی کا پاکیزہ اظہار وجدانی کیفیت پیدا کرتا ہے، جنسِ لطیف، اس کی نفسیات اور نازک مرحلوں میں رمزیاتی اور کنائی انداز ملتا ہے۔

کسی ستم گر نے ہاتھ اٹھا کر جو آج انگڑائی لی ادا سے
شباب سر چڑھ کے خود ہی بولا میں برسر اقتدار آیا
دفعتہً عرض تمنا پہ تری انگڑائی
فطرتہً عقدۂ نازک کا یہ حل کیا کہنا

عام طور پر غنائی شعراء اپنے محدود ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن اسیرؔ صاحب کی شاعری میں غنائیت، گہرائی، وسعت، آفاقیت اور مستقبل سجانے اور سنوارنے کی امنگ ملتی ہے۔ ان کے یہاں تھکن نہیں مستی ہے، زندگی سے پیار ہے، جینے کا حوصلہ ہے، ان کے یہاں یاسیت اور قنوطیت کا گزر نہیں ہے۔ اسی لئے ان کے کلام میں حالتِ نزع، مرگ، پسِ مرگ قبر وغیرہ کا فرسودانہ انداز فغاں دور دور تک نظر نہیں آتا ان کی نظموں میں غنائیت، رومانیت اور سیاست وآلامِ زیست کا حسین امتزاج ملتا ہے وہ انقلاب کے لئے نعرے نہیں لگاتے نہ ہی گرجتے ہیں بل کہ انقلاب میں بھی ایک رومانی کیفیت ووارفتگی ہے جس میں حوصلہ ہے ولولہ ہے ان کی نظموں میں ایک طربناک لطف ولذت کا احساس ہوتا ہے۔

میں وہ شاعر ہوں کہ جو سوز بھی ہے ساز بھی ہے
اک پرستارِ محبت بھی ہے جانباز بھی ہے
جس کی لے میں ہیں محبت کے سریلے نغمے
جس کے نغمات میں ہر دور کی آواز بھی ہے

اسیرؔ ترقی پسند تحریک سے باضابطہ وابستہ نہیں ہوئے لیکن تحریک کا اثر قبول کیا مگر انہوں نے مجبوی اور اضطراری حالت میں بھی تخریبی انداز اختیار نہیں کیا، ان کے یہاں تعمیر، انقلاب اور اک نئی دنیا سجانے کے خواب نظر آتے ہیں انہوں نے ہندوستانیوں کو احساسِ کمتری اور بزدلی کے دلدل سے نکال کر جد وجہد آزادی کے لئے میدانِ عمل میں اتارا۔ ان کے یہاں انسانیت کا درد ہے انہوں نے سرمایہ داری، ظلم وجبر استبداد وتشدد کے خلاف بھر پور صدائے احتجاج بلند کی، ''مزدور'' ''پندرہ اگست ۱۹۴۷ء دو اکتوبر، کارنامہ تلک، دل کی آواز، جیسی نظموں میں مظلوم اور مفلس انسانوں کا درد ہے، مزدوروں سے نہ صرف یہ کہ اظہارِ ہمدردی ہے بل کہ ان کے دکھ درد کی سرگزشت بیان کی۔

اسیرؔ طبعاً غنائی شاعر ہے اس کے لب ولہجہ میں قنوطیت کے بجائے رجائیت ملتی ہے۔ مجازؔ کی طرح موت کی تمنا، مایوسی کا اظہار نہیں ملتا بلکہ زندہ رہنے کا نشہ ہے، زندگی کی تعمیر اور ارتقاء کا نظریہ ملتا ہے۔ ان کے یہاں الفاظ میں ندرت، طرزِ ادا میں دلکشی، اسلوب میں روانی اور شگفتگی ہے، ان کا عشق سماوی وروحانی نہیں بلکہ ارضی اور حقیقی ہے، مگر جسمانی لذت پسندی کہیں نہیں ملتی۔ ان کے یہاں عورت حسن وجمال کے ساتھ وارد ہوتی ہے، ان کی پیکر تراشی تعیش اور لذّت سے آشنا نہیں کرتی، ذوقِ حسن اور ایک شائستہ جمال کی کیفیت سے روشناس کراتی ہے، انہوں نے عورت کے لب ورخسار زلف وقامت کا بیان جدید تشبیہات واستعارات کے ذریعہ کیا ہے، ان کے یہاں فرسودہ تراکیب یا بوجھل اصطلاحات کی کہیں اطلاع نہیں ملتی۔

محنت اگر کرتا نہیں کیا ہاتھ ترے آئے گا
اپنا پسینہ پہلے تو برسائے تب برسے گا ہُن
جُرأت نے جگہ پائی ہے تلوار کے اوپر
جرأت کا پتہ چلتا ہے تلوار کے نیچے
سائے کی طلب آپ کو اوروں کو پھلوں کی
لگ جائیں نہ پتھر کہیں اشجار کے نیچے
ترے آستاں سے آگے جو کوئی مقام ہوتا
تو یہیں ٹھہر نہ جاتے یہ قدم ضرور چلتے

وہ بے حجابانہ آرہے ہیں میں اپنی نظریں جھکا رہا ہوں
گرا کے پلکوں کی چلمنوں کو نقابِ دل سے اٹھا رہا ہوں

(صنعتِ تضاد)

جبیں پانی پانی ہے گردن خمیدہ پشیمانیاں شکل سے آشکارا
حسیں رخ پہ لفیں سرمرّہ آنسو قمر بدلیوں میں افق پر ستارا
جبیں پر شکن ہے نہ ہونٹوں پہ شکوہ نہ رخ پر اداسی نہ آنکھوں میں آنسو
یقیں آہ تم کو دلاؤں میں کیونکر تمہاری قسم ہر ستم ہے گوارا
نگاہ میں کیف لب پہ مستی گداز شانوں پہ زلف برہم
عجب ادا سے وہ آرہے ہیں کہیں تمنا مچل نہ جائے

(پیکر تراشی)

تمہاری شعاعوں سے کچھ دھوپ لے کر
تمہاری ہی پرچھائیں کا روپ لے کر
تمہارے تخیل میں اشعار بن کر
سماتا رہا ہوں سماتا رہوں گا
زلف شب رنگ ہے یوں عارضِ تاباں پہ اسیرؔ
رات کے ہاتھوں میں دامنِ سحر ہو جیسے
کمالِ شعر وشباب بن کر
وہ حاصلِ انتظار آیا
قدم قدم پر نقاب اٹھاتا
چمن میں وہ گل عذار آیا

بحرِ متقارب مقبوض اثلم مضاعف میں لکھی گئی پوری غزل پیکر تراشی کا بہترین نمونہ ہے۔

اداؤں میں فردوس، قدموں میں محشر
نگاہوں میں تسنیم ،ہونٹوں میں زمزم
وہ ہمراہ کیا کیا لئے آرہے ہیں
انہیں دیکھنا اہلِ محفل سنبھل کر

یہ چند اشعار بطورِ مثال پیش کئے گئے ہیں جن میں خیال کی ندرت ، بلیغ تشبیہات واستعارات حسن وجمال کا شگفتہ بیان اور فنی حسن بدرجہ کمال موجود ہے۔اسیرؔ کی شاعری میں فنی حسن درجۂ کمال تک ہے ان کی زبان دھلی منجھی خیال میں پاکیزگی لب ولہجہ میں گھلاوٹ اور شیرینی ہے،ان کا کلام فنی نقائص واسقام سے پاک ہے اسی لئے اپنے معاصرین شعراء میں وہ منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں، وہ اپنے فنی کمال کی وجہ سے ہر دور میں پہچانے جائیں گے ۔اسیرؔ علیگڑھی کی غزلیات ومنظومات ہمیں وضاحت اور تفصیل کا احساس کراتی ہیں نظم گوئی میں اس کی گنجائش ہے لیکن غزل کا دامن بڑا نازک ہے اس کی کامیابی گہرائی ،ایجاز واختصار اور جامعیت میں پوشیدہ ہے ۔ وہ صرف ہمارے وجدان اور احساس کو ہی متاثر نہیں کرتی ہمارے شعور وادراک کو بھی متحرک کرتی ہے، اسیرؔ کے کلام میں جدید رنگ وآہنگ کے اشعار بھی بکثرت ملتے ہیں:

نظر کے پاؤں تھک کر رہ گئے ہیں
کہاں مستور ہیں جلوے تمہارے
جلوہ ہے جلوہ جلوے پہ کیا اختیار ہے
برقِ جمال طور ابھی ہے ابھی نہیں
آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے پیمانہ توڑ دے
یہ بھی ہے کیا سرور ابھی ہے ابھی نہیں

اسیرؔ کی شاعری میں انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، وہ آلامِ روزگار میں اپنا نجی غم بھول جاتے ہیں ، ان کی غزلیات میں نجی درد وکسک کا احساس کم ہی ہوتا ہے، اسی لئے دل سے پھوٹنے والے اس الم میں شدت اور دیرپا تاثیر نظر نہیں آتی:

چاک دل چاک گریباں ہوں تمھیں کیا معلوم
میں اسیرِ غم انساں ہوں تمھیں کیا معلوم
جذبہ عشق نہیں حسن کا احساس نہیں
دردِ انساں کے سوا کچھ بھی مرے پاس نہیں

ترقی پسند تحریک کے رجحانات کے حامی ہونے کے باوجود انہوں نے اردو کلاسک سے اپنا رشتہ ہموار رکھا ۔ غزل گو شعراء کا تصوف پسندیدہ موضوع رہا ہے، دردؔ اور اصغرؔ کی اس روایت کو اسیرؔ نے بھی برقرار رکھا ہے:

اُس شمعِ حقیقت کی ضیاء ہوگئی محفوظ
واللہ مراقلب ہے قندیل کی تمثیل
یہ نقش پا جگہ جگہ زمین وآسماں پہ ہیں
جو بس میں ہو تو ہر طبق الٹ پلٹ کے دیکھ لو

بحر ہزج مثمن مقبوض میں لکھی گئی پوری غزل معرفتِ الٰہی سے بھرپور ہے اسی بحر میں ایک اور غزل تصوف کی بہترین مثال ہے جو مسئلہ وحدۃ الوجود کے تناظر میں لکھی گئی ہے:

کرن ہوں میں نہ دھوپ ہوں تمام آفتاب ہوں
شعور ہو تو دیکھ لو کھلی ہوئی کتاب ہوں
میں جزء وکل کا مسئلہ میں امرِ کن کا فیصلہ
جو انتخاب حسن ہے وہ حسنِ انتخاب ہوں

اسیرؔ نے غزل کی ہیئت میں بھی تجربات کئے ہیں چنانچہ ایک غزل میں مطلع ہی مطلع ہیں جس کے مصاریع ثانی ایک قافیہ کی قید کے ساتھ جس میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ قافیہ وہی ہو جو ردیف ہے:

شرما گئی ہے دیکھ کر تیری نظر نظر
دراصل اب تو ہوگئی مری نظر نظر
تخصیص کر سکے گی فقط دیدہ ور نظر
سرسر ہے جان جان ہے دل دل نظر نظر

ایک غزل ذو قافیتین وذو ردیفین ہے جس میں بدھ ازم کے فلسفہ پر تنقید کی گئی ہے:

متلاشی رہ آگہی یہاں راحتوں کا گزر نہیں
ترا مدعا ہے اگر یہی تو شعورِ ذات میں مات ہے
میں ترا پیام لئے لئے شب وروز پہونچا کہاں کہاں
کبھی ان سے ملاقات منات میں کبھی سومنات میں لات ہے

ایک اور نہایت خوبصورت قابلِ ذکر غزل جس کے اندر قطعہ بند شعر میں ردیف کے لہجہ کی تبدیلی سے متضاد معنیٰ برآمد کئے گئے ہیں:

کیسے کیسے انہیں بخشے ہوئے دنیا کے خطاب
جانِ دل جانِ جہاں جانِ غزل کیا کہنا
وہ تو ہیں جانِ مشیّت انہیں توبہ توبہ
جانِ دل جانِ جہاں جانِ غزل کیا کہنا

ایک غزل کے مصاریع ثانی صرف قافیہ اور ردیف پر مشتمل ہیں ایک جگہ لفظ ''یہ'' چھوڑ کر اور کوئی بھی لفظ قافیہ اور ردیف کے علاوہ نہیں ہے:

ترے دستِ حسیں کو شاذ و نادر تھام لیتا ہوں
خطا ہونے کو ہوتی ہے مگر ہر دم نہیں ہوتی
لبِ دم ہو کوئی تب وہ لبِ اعجاز ہلتے ہیں
دعاء ہونے کو ہوتی ہے مگر ہر دم نہیں ہوتی

اسیر کے کلام مطالعہ ہمیں باور کراتا ہے کہ وہ ایک قادرالکلام شاعر ہیں اور ان کے یہاں تجربات و روایت کی پاسداری بڑے فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے۔اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ان کا کلام ایک لمبی مدت تک قارئین کے حافظے میں محفوظ رہے گا۔

☆☆☆

معنی ومفہوم کے انوار سے روشن جزیرہ

مراق مرزا
فلم رائٹر وڈائرکٹر، اندھیری ویسٹ، ممبئی (موبائل:9004031849)

برصغیر ہند و پاک کے علاوہ دیگر اردو دنیا کے ادبی حلقوں میں بھی تسلیم انجم ایک معروف ومعتبر نام ہے جنہیں اہل ادب بحیثیت شاعر جانتے اور پہچانتے ہیں۔ انجم غزل کے شاعر ہیں اور گزشتہ پینتالیس پچاس برسوں سے اپنے احساسات ومشاہدات کی زمین پر غزل کے پھول کھلا رہے ہیں۔ غزل سے متعلق ایک گمان یا ایک کمزور نظریہ ہے جس کا ذکر شعرا و ادبا کے درمیان اکثر ہوتا ہے۔ کچھ اہل قلم کا ماننا ہے کہ غزل ایک بے حد آسان صنف شاعری ہے۔ اس کے مقابلے میں نظم قطعہ، دیگر شعری اصناف مشکل ہیں۔ اپنے اس نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے وہ دلیل کے طور پر کہتے ہیں زیادہ تر نوجوان نو وارد شعرا اپنی شاعری کا آغاز غزل ہی سے کرتے ہیں۔ یہ رواج ماضی میں بھی تھا اور آج بھی ہے۔ مجھے اس حقیقت سے اتفاق ہے کہ ہر نو وارد شاعر غزل ہی سے شعر کہنے کی ابتدا کرتا ہے۔ تاہم اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غزل کہنا سہل امر ہے۔ بشیر بدر کا شعر ہے:

کبھی کبھار چمکتی ہے آنسوؤں سے زمین
غزل کے شعر کہاں روز روز ہوتے ہیں

غزل کہنا اتنا ہی مشکل فن ہے جتنا کہ دیگر اصناف سخن میں شاعری کرنا۔ بلکہ کچھ معنوں میں غزل دیگر شعری فارمز سے قدرے مشکل دکھائی دیتی ہے۔ وضاحت کی ضرورت نہیں کہ غزل کے ہر شعر میں ایک مکمل مضمون پرویا جاتا ہے جب کہ نظم کے سیکڑوں مصرعوں میں محض ایک کہانی بیان کی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے غزل کا راستہ یقیناً دشوار گزار نظر آتا ہے۔ تسلیم انجم نے اسے تخلیقی اظہار کے لئے غزل کی راہ چنی ہے اور یہ بات ان کی فکری وسعت وعمیقیت کا ثبوت ہے۔ وہ پابند یا آزاد نظم کے آسان راستے پر نہیں گئے۔ ان کی غزلیات کا مسودہ حال ہی میں میرے مطالعے سے گزرا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے سفر حیات میں بہت سے حادثات وتجربات ومشاہدات کو وہ شعری قالب میں سجاتے نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی ہر غزل گزرتے ہوئے وقت اور حالات کا آئینہ نظر آتی ہے اور ہر شعر اپنے اندر ایک پُراثر کہانی لئے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

ویرانیوں کے شہر میں خالی مکان ہوں
اپنی شکستگی کا میں خود ترجمان ہوں
طوفان وقت بھی کوئی جھٹکا نہ دے سکا
میں رہگزار زیست پہ ایسی چٹان ہوں
ہر ایک سمت یہ منظر دکھائی دیتا ہے
کھنڈر سا اپنا بھی اب گھر دکھائی دیتا ہے
کچھ آشنا سا مجھے لگ رہا ہے اے انجم
جو میرے جسم کے اندر دکھائی دیتا ہے
فکر کے دوش پہ لفظوں کا جنازہ نکلا
اوڑھ کے چادرِ خوں میرا سراپا نکلا
ذہن کی آنکھ کھلی تب مجھے احساس ہوا
جس کو سمجھا تھا حقیقت وہی سایا نکلا

ہر چند کہ درج بالا تمام اشعار ذاتی تجربات کے مصوّر دکھائی دے رہے ہیں تاہم ان کا رشتہ شاعر کے گرد ونواح کی دنیا سے بھی ہے۔ ویرانیوں کے شہر میں جو خالی مکان ہے وہ کسی ایک گھر یا ایک زندگی کی کہانی یا المیہ نہیں ہے۔ یہ ہمارے اپنے وطن کے ایک بہت بڑے طبقے کی کربناک داستان ہے۔

جب کوئی گھر کھنڈر سا دکھائی دینے لگے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اس گھر میں رہنے والے لوگ کن معاشی و سماجی حالات سے گزر رہے ہوں گے۔ مسرت کی بات ہے کہ تسلیم انجم کے اشعار خواب و خیال کی تصویریں نہیں دکھاتے بلکہ زندگی سے وابستہ مسائل کو اپنے قاری کے روبرو لاتے ہیں۔ ان کا یہ تخلیقی اختصاص انہیں معتبر شعرا کے زمرے میں کھڑا کرتا ہے۔ چند اشعار مزید دیکھیں:

بکھرے ہوئے ہیں دہر میں خوابوں کے سلسلے
میرے لئے مگر ہیں عذابوں کے سلسلے

الفاظ کے جزیرے میں بھٹکا ہوا ہوں میں
قسمت میں میری بس ہیں کتابوں کے سلسلے

یہ کیسا وقت ہے، یہ انقلاب کیسا ہے
ہر ایک آدمی اپنا خدا لگے ہے مجھے

گھر میں خود آگ لگا دی جائے
پھر محلے کو صدا دی جائے

دل سے ابھری ہوئی اک اک خواہش
تھپکیاں دے کے سلا دی جائے

اوپر پیش کئے گئے سبھی اشعار اپنے اندر خاص معنی و مفہوم رکھتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو فکر و احساس کی ایک دنیا میں لے جاتے ہیں، ایک ایسی دنیا جو ہماری ہی دنیا ہے، جس میں ہم ہی جیتے ہیں لیکن کیا یہ زندگی واقعی زندگی ہے؟ جہاں ہر ایک خواہش کو تھپکیاں دے کر سلانے اور اپنے گھر میں خود ہی آگ لگانے کے لئے لوگ آمادہ ہوں وہاں زندگی کی تصویر کیسی ہوگی، یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے اشعار شاعر کی فکری گہرائی گیرائی نیز اس کی حساسیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو شاعر صرف اپنے ہی درد و الم کی چیخ سن پاتا ہے اس کا دائرۂ تخلیق محدود ہوتا ہے۔ جب غمِ دوراں شاعر کی ذات میں اترتا ہے تب کوئی میر و غالب اور اقبال بن کر آسمان ادب پر ابھرتا ہے۔ تسلیم انجم بھی غمِ زمانہ کو اپنی ذات سے وابستہ کر کے شعر کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا خود کو اپنے اشعار سے بے حد قریب محسوس کرتا ہے:

نکلو نہ تیز دھوپ میں باہر مکان سے
شعلے برس رہے ہیں ابھی آسمان سے

سبھوں کے جسم سے لپٹی ہے خوف کی چادر
عجیب شہر کا منظر دکھائی دیتا ہے

زمین لگتی ہے میدان جنگ کی صورت
چمک رہا ہے لہو آج رنگ کی صورت

زندگی جس کو سمجھتا رہا میں صدیوں سے
انجم خستہ وہی ریت کا صحرا نکلا

ایسا محسوس ہوتا ہے اپنے تخلیقی اظہار کے لئے تسلیم انجم نے دانستہ طور پر ثقیل الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے اور نہایت سلیس زبان میں اپنے خیالات کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ میر و داغ ہوں یا جگر و سودا یا اقبال و غالب ان جیسے تمام باکمال شعرا کے وہ شعری تخلیقات مقبول عام ہوئیں جو عام فہم زبان میں کہی گئی تھیں:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غالب کے یہاں محولہ بالا شعر کے طرز کے بہت سے اشعار موجود ہیں مگر یہ کلام ریسرچ اسکالرز اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے لئے نہیں ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شاعر اور شاعری کی مقبولیت کا تعلق عام قارئین سے ہوتا ہے۔ ادب کے تمام بڑے شعرا کے سیکڑوں اشعار عوامی زبان میں پائے جاتے ہیں اور انہی اشعار کی اساس پر ان کا رشتہ عام قارئین سے قائم ہے۔ تسلیم انجم کی پوری شاعری ثقالت سے مبرّا ہے۔ ایک بھی شعر قاری کے فکر و ذہن پر بوجھ نہیں بنتا ہے۔ یہ ان کی تخلیقی کاوش کے چند اہم اختصاصات میں سے ایک ہے۔ وہ عام فہم زبان میں اپنی بات اتنے سلیقے سے کہتے ہیں کہ اشعار کے مفاہیم بڑی آسانی سے قارئین کے قلوب و اذہان میں اُتر جاتے ہیں اور وہ ان کی کیفیات و اثرات سے محفوظ و مسرور ہوا ٹھتے ہیں۔ تسلیم انجم کی شاعری کے بغور مطالعہ کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ اپنے افکار و خیالات کے اڑن کھٹولے پر سوار ہو کر وہ الفاظ کے جس جزیرے پر پہنچ چکے ہیں۔ ان ایک غزل بطور نمونہ پیش خدمت ہے۔

اے ستم گر تمہارے ہاتھوں سے
میرے ارماں کی آج موت ہوئی

غم ہی ہر دم مرا شریک رہا
بھول سے بھی خوشی نہیں آئی

میرے اُجڑے ہوئے گلستاں میں
کیا۔۔؟ نہیں آئے گی بہار کبھی

یاد سے تیری ہو گئی آباد
دل کی وادی میں اک نئی بستی

آتے ہی بس ہمیشہ تیرا خیال
کِھل گئی آرزوئے دل کی کلی

میرا ہمدم ہے خانۂ دل میں
جس کی الفت کی آج شمع جلی

رسمِ الفت بڑھا کے ہوں بدنام
مجھ سے انجم یہی تو بھول ہوئی

☆☆☆

''دیکھ لی دنیا ہم نے'': سینکڑوں صفحات میں بکھری غضنفر کی ایک مختصر دنیا

ڈاکٹر شکیل احمد
مئوناتھ بھنجن (یوپی) (موبائل:9236722570)

اصنافِ ادب میں خودنوشت سوانح کا مطالعہ کچھ الگ ہی ذہنی اور فکری ذائقہ رکھتا ہے۔ خوش ذائقہ دسترخوان کی طرح یہاں بھی سیری تو ہو جاتی ہے مگر طبیعت نہیں بھرتی۔ جن کی طبیعتیں، کسی کی خودنوشت کے مطالعہ یعنی ان کی چھوٹی سی دنیا میں تاک جھانک سے نہیں اکتاتیں وہ کتاب کے آخری صفحات کے مطالعہ تک پہنچتے پہنچتے ویسی ہی اداسی سے گزرتی ہیں جیسی اداسی ماں کی انگلی تھام کر نانہال سے گھر کی طرف قدم بڑھاتے وقت گزرا کرتی تھی۔ بچپن میں تو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔ اپنے گھر میں گزر بسر کے تمام روشن دان بھلے ہی ہم پہ کھلے ہوں لیکن نانہال میں چند روز کی پرمسرت آزادی کی کھلی کھڑکیوں کے نظارے کچھ اور ہی ہوا کرتے تھے۔ ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' کے مطالعہ کے بعد یہی محسوس ہوا۔

غضنفر کی خودنوشت کے اختتام تک پہنچنے کی نوبت آئی تو اس ادھیڑ عمر میں بھی بچپن کے نانہال کا منظر دماغ میں گھوم گیا۔ کتاب کی آخری سطریں پڑھتے پڑھتے آنکھ جھپکی تو محسوس ہوا کہ ایک دنیا تو غضنفر کے ساتھ ہم نے بھی دیکھ لی۔ گاؤں کی، بچپن کی، اسکول کالج، یونیورسٹی کی، والدین عزیز رشتہ داروں اور پڑوسیوں کی، کلاس روم، اساتذہ اور احباب کی، ملازمت کی فکرمندی، اور حصولِ ملازمت کے بعد اس کی ناز برداری اور مجبوری کی، کبھی اس شہر، کبھی اس نگر، کہیں شاہراہ، کہیں پگڈنڈی، قلم، قدم اور قیام کی فکرمندی کی دنیا۔ ملازمت اور کار مفوضہ سے سبک دوشی کی زندگی، جو اپنے ساتھ کئی آزمائشیں اور کبھی کبھی، کسی کسی کے ساتھ تو غیر متوقع کشاکش بھی ساتھ لاتی ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ بچپن میں یتیمی کی تپش جھیل لینے والوں کو یہ دنیا نسبتاً کم ڈراپاتی ہے۔ رد عمل میں دوسروں کا درد محسوس کرنے کی صلاحیت میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور حلقۂ یاراں ہو یا دائرہ دیدہ وراں اپنی شناخت خود پیدا کرنے کی صلاحیت بھی، خوش آمدید کہتے نظر آنے لگتی ہے۔ غضنفر نے ماں کی شفقت تو کم پائی لیکن والد اور احمد اللہ چچا کے لاڈ پیار سے وافر حصہ ملا۔ یہ احمد اللہ چچا ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتے:

> ''میری بیماری اور تیمارداری کو لے کر احمد اللہ چچا ابا سے کہیں زیادہ فکرمند رہتے تھے۔ ان کی فکرمندی کی وجہ یہ تو تھی ہی کہ وہ حساس اور دردمند انسان تھے۔ کسی کا بھی دکھ دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے۔ یہ سبب بھی تھا کہ اماں کے مرنے کے بعد میں ان کے حوالہ کر دیا گیا تھا... وہ ایسی نرمی سے پیش آتے تھے کہ اکثر اماں یاد آجاتی تھی۔ بالکل اماں والا برتاؤ ہوتا تھا ان کا۔''
>
> ''ابا کے بارے میں بھی کچھ بتاتا چلوں کہ ابا بھی تو احمد اللہ چچا ہی کے دوست تھے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ میں اپنے والد کی قصیدہ خوانی کر رہا ہوں مگر یقین جانیے کہ میں ان کے بارے میں جو بھی کہنے جا رہا ہوں اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ کہیں سے بھی کوئی مبالغہ نہیں ہے۔'' (ص 30)
>
> ''....ابا دوسروں کو اس طرح سنتے جیسے کوئی ماں اپنے بچوں کو سنتی ہے۔ وہ صرف سنتے ہی نہیں تھے بلکہ باتوں کا اثر بھی لیتے تھے اس اثر کا اثر بھی ہوتا تھا۔ اس کے من کا بوجھ اتر جاتا تھا۔'' (ص 33)

یہ سطریں کتاب کے ابتدائی صفحات کی ہیں جہاں گاؤں میں حساس درمند اور فکرمند افراد کی ایک چھوٹی سی دنیا آباد ہے جہاں بچے ہوش سنبھالتے ہیں۔ رشتوں کے پالنے میں جھولتے جھولتے دور نزدیک کی تعلیم گاہوں میں پہنچ کر دنیا کو ذرا قریب سے دیکھنے کا شعور حاصل کرتے رہتے ہیں اور ایک دن خود احمد اللہ چچا اور ابا بن کر دوسروں کے لئے مرکزِ نگاہ بن جاتے ہیں۔ زندگی کا پہیا گردش کرتا رہتا ہے۔ نئے چہرے نئے ماحول اور نئے رشتوں کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے زندگی کی گاڑی اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ غضنفر کے ساتھ کچھ الگ نہیں ہوا۔ دنیا نے ان کے ساتھ بھی تقریباً ویسا ہی سلوک کیا جیسا صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے۔

علی گڑھ، دہلی، پٹیالہ اور لکھنؤ تو پڑاؤ کی صورت میں پیش آئے مگر پٹنہ، کراچی، کلکتہ، ممبئی، میسور اور دوحہ قطر میں چند روزہ قیام نے زندگی کے اتھاہ تجربوں سے روبرو کرایا اور یہ سبھی خوشگوار، پسند ناپسند تجربے سمٹ کر غضنفر کی اس کتاب کے صفحات میں بکھر گئے ہیں۔ واقعات تو بہت ہیں۔ مناظر تو پے در پے ہیں۔ مراحل یکے بعد دیگرے ہیں۔ پھر بھی چند نمونے تو پیش کرنے ہی ہوں گے جن میں زبان کی لطافت اور ذہن وفکر میں جگہ بنا لینے والے مناظر کے ساتھ وافر مقدار میں نفسیاتی اور سماجی تجربے بھی ہیں۔ نیز احباب کی نوازشات اور اساتذہ کی کرم فرمائیاں بھی۔

''جن دنوں ہمارے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا اور ہم طلب وصال یا کرب وہجر ستم شعار میں مر رہے تھے۔ اور باباؤں کے چکر میں یہاں وہاں مارے مارے پھر رہے تھے۔ کسی نے بتایا کہ ہم اپنے دوست نعیم نعمانی کے ابّا کے پاس کیوں نہیں جاتے۔ وہ بھی تو دعا تعویذ کرتے ہیں۔''(صفحہ 62)

جس دوست نے علی گڑھ میں میرا فارم بھرا تھا وہ میرا وہی دوست تھا جس کے گھر پر میں حالت جنون میں پہنچا تھا اور جس سے کہا تھا کہ آج میرا آخری دن ہے اور میرے مرنے کے بعد تم میری لاش کو میرے گھر پہنچا دینا۔ اس کا نام نسیم تھا۔ میں اسے بہت چاہتا تھا۔)صفحہ 79)

''اٹھو اے شیدائے شامِ مصر و شبِ شیراز! اٹھو اے جویائے نشاناتِ قافلۂ حجاز اٹھو کہ تمہارا خواب پورا ہوا۔ درسگاہ عالیہ سے تمہارا بلاوا آ گیا...''

یہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ میرا جگری دوست نسیم تھا۔ نسیم کی اس کرشمائی خبر نے مجھے ایک ویران اور اجاڑ بستی سے نکال کر ایک وادیٔ پر بہار میں پہنچا دیا جہاں کی ہر شام واقعی شام مصر تھی اور ہر شب سچ مچ شب شیراز''(صفحہ 86)

''دورانِ لکچر استاد محترم جناب نسیم قریشی صاحب نے یونہی پوچھ لیا کہ میرے آنے میں دیر کیوں ہوگئی۔'' سر! سردی ہوگئی تھی۔'' میرا جواب سن کر میرے پاس کے لڑکے ہنس پڑے۔ نسیم قریشی صاحب کے ہونٹ بھی تبسم ریز ہو گئے۔ اس ہنسی کے سبب پر میں غور کر ہی رہا تھا کہ ایک لڑکے کے منہ سے ایک جملہ اچھل پڑا۔ سر! یہ بہاری ہیں نا، ان کو سردی ہوتی ہے لگتی نہیں ہے۔'' قہقہوں کی ضرب نے میرے دل و دماغ نے جھنجھناہٹ تو بہت پیدا کی۔ مگر اس کی چوٹ سے مجھ میں ایک زوردار آواز ابھری'' ہنس لو۔ مگر یہ ہنسی بہت مہنگی پڑے گی۔''(صفحہ 89)

کچھ دنوں کے بعد سعیدہ آپا نے محسوس کیا مینائی صاحب پڑھاتے کم اور پڑھتے زیادہ ہیں۔ ان کے ہونٹ تو کبھی کبھی دیر تک بندرہ جاتے۔ مگر آنکھیں بغیر کسی وقفے کے بولتی رہتی ہیں۔ یہ بات انہوں نے اپنے شوہر نقوی صاحب کو بتائی اور یہ بھی کہا کہ وہ کسی بہانے سے مینائی صاحب کو منع کر دیں کہ اب وہ نہ آیا کریں۔ نقوی صاحب نہایت بے باک اور صاف گو انسان تھے۔ بہانہ کیا ڈھونڈتے سیدھے ایک دن مینائی صاحب سے ہم کلام ہوتے ہوئے مدعا پر آ گئے۔'' میں نے محسوس کیا کہ آپ سعیدہ کو پڑھاتے کم اور پڑھتے زیادہ ہیں۔'' نہیں تو میں تو سعیدہ بی بی کو اپنی والدہ کی طرح سمجھتا ہوں۔'' دیکھیے آپ کو چھوٹی عمر کی مائیں اچھی لگتی ہوں گی۔ مگر مجھے عمر دراز بیٹا نہیں چاہیے۔ امید ہے کہ آپ میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں گے۔ خدا حافظ۔''(صفحہ 133)

ہیڈ کو جیب میں رکھنے کا ہنر زاہد کو خوب آتا تھا..... یونیورسٹی انتظامیہ ہی میں نہیں بلکہ زاہد کی پینٹھ حکام شہر میں بھی تھی ..... زاہد کی حکام میں یہ پینٹھ کسی سرکاری یا نیم سرکاری وساطت یا خاندانی فضیلت کے باعث نہیں تھی بلکہ ان کی اپنی ذہانت وفطانت اور شخصیت کی دبازت کی بدولت تھی۔(صفحہ 145)

یونیورسٹی کے زمانہ طالب علمی اور اس کے دائیں بائیں کے ان نمونوں کے بعد وہ اقتباسات بھی ملاحظہ ہوں جہاں غضنفر نے اپنے بزرگوں کی طرح اپنے اساتذہ اور محسنوں کا بھی ذکر دلنشین اور ملتجیانہ انداز میں کیا ہے جن سے ان کی احسان شناسی اور فطری اعلیٰ ظرفی کی خوشبو پھیلتی محسوس ہوتی ہے:

''نسیم قریشی صاحب کی حسِ مزاح زبردست تھی، بات بات میں وہ مزاح کا پہلو نکال لیتے تھے اور ہر دو چار منٹ کے بعد کوئی ایسا شگوفہ چھوڑ دیتے تھے کہ پورہ کلاس زعفران زار بن جاتا تھا۔''(صفحہ 93)

''ایک بار میں یرقان کے مرض میں مبتلا ہوا تو میرے اساتذہ بار بار اسپتال میں مجھے دیکھنے آئے۔ ساتھ میں پھل بھی لائے، عتیق احمد صدیقی صاحب تو اپنے گھر سے مونگ کی دال کی کھچڑی بھی پکوا لائے..... عتیق صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو رکشے کا کرایہ پانچ روپے دیتے ہیں تو سرکار سے پانچ ہی روپے طلب کرتے ہیں۔''(صفحہ 95)

''نادر علی خان نے ایک بار پتہ نہیں کیسے بھانپ لیا کہ میں کسی معاشی بحران سے گزر رہا ہوں۔

ایک دن انہوں نے کلاس ختم ہونے پر میرے ہاتھ میں لفافہ تھما دیا اور کہا کہ میں اسے کمرے پر لے جا کر کھولو، کمرے پر جا کر لفافہ کھولا تو اس میں تہہ کر کے رکھے ہوئے کاغذات کے اندر سے ہرے ہرے کچھ نوٹ نکلے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ استاد کی مشفق نظروں نے میرے حالات اور میری اندرونی کیفیات کو تاڑ لیا ہے۔''

''ایم اے فائنل کی کاپی پر ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی جیسے جید اسکالر کے قلم سے لکھے گئے اس Good نے مجھے ہفتوں نرسری کا بچہ بنائے رکھا۔ یہ ایسا Good تھا جو کبھی بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوا۔ جس نے مجھے اچھا بنانے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔'' (صفحہ 98)

''شعوری یا لاشعوری طور پر استاد محترم قاضی عبدالستار سے یہ ہنر بھی حاصل ہوا کہ تحریر میں فسوں کیسے پھونکا جاتا ہے اور زبان و بیان کا جادو کس طرح جگایا جاتا ہے اور یہ کہ لسانی طلسم سے اقلیم ادب کے کیسے کیسے در کھولے جاتے ہیں۔'' (صفحہ 100)

''اور استاد محترم شہریار صاحب تو ایسے لگے جیسے استاد کے روپ میں مجھے کوئی مخلص دوست کوئی ہم عمر بھائی اور کوئی شفیق باپ مل گیا ہو۔ استاد ہو کر بھی انہوں نے ایسی بے تکلفی دکھائی اور ان کے مشفقانہ رویے نے ایسا حوصلہ بخشا کہ میں اپنی ٹوٹی پھوٹی شاعری لے کر ان کے پاس پہنچ گیا نہ صرف یہ کہ انہوں نے توجہ سے میری غزلیں سنیں بلکہ بعض مصرعوں میں اصلاح بھی فرمائی۔'' (صفحہ 102)

درج بالا چند اقتباسات سے پوری کتاب کے اسلوبِ تحریر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ واقعات بہت ہیں سرگزشتیں اور رام کہانیاں بھی بہت ہیں جن کے مزید ذکر کی اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ لیکن اتنا عرض کرتا چلوں کہ کتاب کے مطالعہ کے اختتام پر آپ بھی

> کچھ دنوں کے بعد سعیدہ آپا نے محسوس کیا مینائی صاحب پڑھاتے کم اور پڑھتے زیادہ ہیں۔ ان کے ہونٹ تو کبھی کبھی دیر تک بند رہ جاتے۔ مگر آنکھیں بغیر کسی وقفے کے بولتی رہتی ہیں۔ یہ بات انہوں نے اپنے شوہر نقوی صاحب کو بتائی اور یہ بھی کہا کہ وہ کسی بہانے سے مینائی صاحب کو منع کر دیں کہ اب وہ نہ آیا کریں۔ نقوی صاحب نہایت بے باک اور صاف گو انسان تھے۔ بہانہ کیا ڈھونڈتے سیدھے ایک دن مینائی صاحب سے ہم کلام ہوتے ہوئے مدعا پر آ گئے۔ ''میں نے محسوس کیا کہ آپ سعیدہ کو پڑھاتے کم اور پڑھتے زیادہ ہیں۔'' نہیں تو میں تو سعیدہ بی بی کو اپنی والدہ کی طرح سمجھتا ہوں۔'' دیکھیے آپ کو چھوٹی عمر کی مائیں اچھی لگتی ہوں گی۔ مگر مجھے عمر دراز بیٹا نہیں چاہیے۔ امید ہے کہ آپ میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں گے۔ خدا حافظ۔''

وہی کچھ محسوس کریں گے جن کا اظہار میں نے ابتدائی سطروں میں کیا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران سفر نامے کی جھلک، خاکہ نگاری کا عکس اور ذرا ذرا ناول کا اسلوب بھی ملے گا۔ آب بیتی تو یہ ہے ہی لیکن مبالغہ کی بو باس تک نہیں۔ خودنمائی اور خود فریبی کی کمزوریاں کہیں نظر نہیں آئیں گی۔ باہمی انسانی رشتوں کے متعدد مقدس اور ذہن کشا واقعات بھی اس کتاب میں اپنا خوش رنگ جلوہ بکھیر رہے ہیں جن میں صاحب سنگھ ورما (دہلی کے سابق وزیر اعلیٰ) کا رنگ سب سے چوکھا اور نمایاں ہے۔ اور ان سے ذرا پھیکا سا امر سنگھ نگار کا۔ جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں کتاب کے صفحات پر متعدد شخصیات کے خوش رنگ خاکے مختصر یا تفصیلی موجود ہیں جو اس آب بیتی کی قدر و قیمت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

اس آب بیتی میں کوئی باب نہیں۔ کوئی عنوان نہیں۔ درمیان میں حد فاصل کی غرض سے ہلکی سی لکیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ صفحہ 13 سے شروع ہو کر یہ آب بیتی 336 پر ختم تو ہو جاتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ غور و فکر اور فہم و ادراک کے کئی باب بھی قاری کے لئے کھول جاتی ہے ہاں ایک کمی بار بار محسوس ہوئی کہ ماہ و سال کا تذکرہ ہوتا تو بڑا اچھا ہوتا۔ سرگزشت حیات میں ماہ و سال کی خاصی اہمیت ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر میں اردو میں لکھی گئی درجن بھر آپ بیتوں میں ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' اپنے نام، اسلوب تحریر، واقعات کی ترتیب محترم شخصیات اور بے تکلف احباب اور رفقائے کار کے ذکر کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہے۔ جس میں اعتدال اور توازن کی زیریں لہریں، شوق مطالعہ کو مہمیز کرتی رہتی ہیں اور حاصل مطالعہ کے بعد قاری کے ہاتھ اتنا کچھ آ جاتا ہے کہ اسے بھی احساس ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنی دیکھی بھالی دنیا کے ساتھ ایک اور دنیا کی بھی سیر کر لی ہے۔

☆☆☆

خاکہ نگاری شخصیت کے آئینے میں

شبیر احمد ملک
ریسرچ اسکالر، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ (موبائل: 7006697724)

خاکہ نگاری کو شخصیت نگاری، مرقع نگاری اور قلمی مصوری بھی کہا جاتا ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے خاکہ نگاری کسی شخصیت کی ہو بہو تصویر کشی کا نام ہے۔ بہ الفاظ دیگر کسی شخص کے ہمہ جہت، ظاہری اور باطنی خصائص ونقائص اس کے ہم رنگ اور تہہ دار پہلوؤں کو موثر اور دلچسپ انداز سے اس طرح پیش کیا جائے کہ حقیقی افراد کی چلتی پھرتی تصویر سامنے آئے۔ یہی خاکہ نگاری ہے۔ یہ کسی فرد واحد کی گم صم تصویر نہیں بلکہ ہنستی بولتی تصویر ہے جو ہمارے احساس کو برانگیختہ کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خاکہ نگاری اردو ادب کی ایک لازوال صنف ہے جس میں شخصیتوں کی تصویریں اس طرح براہ راست کھینچی جاتی ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن دونوں قاری کے ذہن نشین ہوجاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوجائے کہ پڑھنے والے نے نہ صرف قلمی چہروں کو دیکھا ہے بلکہ خود اصل شخصیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

لفظ خاکہ انگریزی اصطلاح Sketch کا متبادل ہے جس کے لفظی معنی وہ نقشہ کے ہیں جو صرف حدود کی لکیریں کھینچ کر بنایا جائے یا ڈھانچہ تیار کیا جائے۔ لفظ خاکہ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اگر ایک مصور کسی شخص کی مکمل تصویر بنانے کی جگہ صرف چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے اس شخص کے خدوخال کی جھلک پیش کرتا ہے تو بھی اسکیچ کہلاتا ہے۔ ادبی خاکہ اس سے تھوڑا مختلف ہے۔ یعنی اس میں خاکہ نگار جس شخص کا خاکہ قلم بند کرتا ہے اس کے متعلق چند اہم پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے تاکہ اسکی پوری شخصیت ابھر کر سامنے آجائے۔ خاکے کے لئے اردو ادب میں 'قلمی تصویر'، 'مرقع' جیسی اصطلاحیں بھی مروج ہیں۔ اس سلسلے میں نثار احمد فاروقی یوں رقمطراز ہیں:

> ''اسکیچ کے لئے اردو میں خاکہ نگاری، مرقع، قلمی تصویر وغیرہ اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ ان میں خاکہ سب سے زیادہ موزوں ہے کیونکہ اسکیچ (Sketch) کا پورا مفہوم اسی لفظ سے ادا ہوتا ہے۔ ادب کی جس صنف کے لئے ہم انگریزی میں اسکیچ (Pen portrait) کا لفظ بولتے ہیں اس میں کسی شخصیت کے اہم اور منفرد پہلو اجاگر کئے جاتے ہیں''۔ (بحوالہ اردو خاکہ نگاری، محمد حسین جامی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2010، ص06)

اسکیچ مصوری کی اصطلاح ہے جس میں چند لکیروں کی مدد سے کسی شخصیت کے چہرے کے خدوخال واضح کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ادب کی اس صنف میں الفاظ کو وہی اہمیت حاصل ہے جو مصوری میں لکیروں کی ہے۔ خاکہ نگار کو کم سے کم الفاظ میں شخصیت کے نمایاں اوصاف اجاگر کرنے ہوتے ہیں۔ یہ کام ایک خاص سلیقے اور دقت نظر کا طالب ہے کیونکہ خاکہ نگار کے پاس واقعات و تاثرات کا انبار ہوتا ہے اور اسے ان میں سے ایسے واقعات کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جس کے آئینے میں پوری شخصیت کا عکس نظر آئے کیونکہ غیر ضروری تفصیلات اور واقعات کی بھرمار سے خاکہ کا تاثر مجروح ہوتا ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خاکہ نگار کو کس قسم کے واقعات کا انتخاب کرنا چاہئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ شخصیت کے انتخاب میں انتہا درجے کی ہوشیاری برتے کیونکہ ادب کا قاری سے کافی گہرا رشتہ ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ قاری جب خاکے پڑھتا ہے تو ایک ساتھ اس پر دو طرح کے تاثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ جہاں وہ خاکے سے محظوظ ہوتا ہے وہیں دوسری طرف اس عظیم شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں سے اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں اور لاپروائیوں کو آپس میں موازنہ کرکے درستی کی کوشش کرتا ہے۔ قاری اچھے یا برے جو بھی تاثرات نمایاں ہوتے ہیں اس کے پیچھے خاکہ نگار کے محرکات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ یعنی ایسا کون کا جذبہ یا سوچ کارفرما ہے جس نے مصنف کو خاکہ لکھنے پر مجبور کیا۔ اس کے متنوع وجوہات ہوسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صلاح الدین یوں لکھتے ہیں:

''خاکہ نگاری کے محرکات میں کبھی تو کسی سے عقیدت کے جذبے کا ہونا یا کسی مذکورہ شخصیت میں غیر معمولی اوصاف کا پایا جانا شخصیت اور شخصیت نگار کے درمیان مزاج اور سیرت کی ہم آہنگی کا پایا جانا یا کبھی شخصیت سے دائمی جدائی ہوجانا یا اپنے دوستوں ،جاننے والوں اور احباب سے ذاتی نوعیت کے تعلقات کا ہونا یا اسلاف پرستی کے جذبے کا ہونا یا کسی سے ملاقات یا تعارف کے بعد متاثر ہوجانا جیسے عوامل شامل ہوا کرتے ہیں''۔ (حوالہ دلی والے، مرتب صلاح الدین، دہلی اردو اکادمی، 1986ء، ص28)

اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ جن پر بھی خاکہ لکھا جارہا ہو وہ ضروری نہیں کہ عظیم شخصیت کے مالک ہوں، بلکہ ایک عام انسان بھی خاکہ کا موضوع ہوسکتا ہے۔ مولوی عبدالحق ''چند ہم عصر'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ امیر اور دولت مند پر لکھے خاکے ہی پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریب اور عام انسان میں بھی ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ہمارے لئے سبق آموز ہوسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے حالاقلمبند کرتے ہیں میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں۔ اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں ، امیروں اور بڑے لوگوں کے ہی حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہوسکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں غریب اور امیر کوئی فرق نہیں''۔ (حوالہ چند ہم عصر، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، 2015ء، ص102)

خاکہ نگاری میں موضوع بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ خاکہ کا موضوع کوئی نہ کوئی انسان ہوتا ہے۔ انسان ایک وسیع موضوع ہے جس کے گوشے گوشے تک رسائی عام ذہن کے بس کی بات نہیں ہے۔ خاص کر جس شخص پر خاکہ لکھا جائے اس کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ خارجی پہلوؤں کا بیان تو بہ نسبت آسان ہے لیکن داخلی مطالعہ کے لئے خاکہ نگار کو کافی تجربہ کار ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے خاکہ نگار کے لئے موضوع خاکہ کی شخصیت کو روشنی میں لانے کے لئے تین باتوں کا ذکر کیا ہے:

''۱۔ وہ باتیں جنہیں اخلاقی محاسن سمجھا جاتا ہے جیسے حیا، خلوص، معصومیت، رواداری، ایثار ، عقل، خوش معاملگی اور تجربہ علمی وغیرہ۔

۲۔ وہ باتیں جنہیں اخلاقی معائب سمجھا جاتا ہے جیسے مغلوب القضی، خود غرضی، الحاد، بدزبانی اور جنسی بے راہ روی وغیرہ۔

۳۔ وہ باتیں جنہیں نہ اخلاقی خوبیاں سمجھا جاسکتا ہے اور نہ خامیاں جیسے ایک خاص قسم کا لباس پہننا، کرسی پر اکڑوں بیٹھنا، ایک خاص انداز میں چلنا، بلند آہنگ قہقہے لگانا، بلیاں یا کبوتر پالنا، پتنگ اڑانا، ہجوم میں بدحواس ہوجانا، چٹپٹی چیزیں کھانا، حقے یا پان سے رغبت ، گرمیوں میں گرم پانی سے غسل کرنا، خوشی کے موقع پر غمگین ہوجانا، یادوں سے جی بہلانا، خیالی پلاؤ وغیرہ۔'' (بحوالہ خاکہ نگاری فن وتنقید، ڈاکٹر بشیر سیفی، نذیر سنز لاہور، 1993ء، ص11)

خاکہ نگاری میں شخصیت کے بیان میں صرف عیب جوئی بہتر شخصیت نگاری کہلانے کی مستحق نہیں۔ بلکہ عیب پوشی کا نام بھی شخصیت نگاری ہے۔ جس طرح خاکہ کے لئے ایک منفرد شخص کا انتخاب ہوتا ہے اسی طرح خاکہ نگاری کی شخصیت میں بھی چند خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ جس شخص پر خاکہ لکھا جاتا ہے خواہ امیر ہو یا غریب عام ہو یا خاص اس میں کچھ عام انسانوں سے ہٹ کر خصلتیں ہوا کرتی ہیں جس کی سچی عکاسی ایک بہترین خاکہ نگار ہی کرسکتا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے ایک خاکہ نگار کے لئے مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہونا لازمی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کامیاب خاکہ نگار وہ ہے جس کی آستین میں روشنی کا سیلاب چھپا ہو اور جو واقعات کے اوپری

پرت کے نیچے معلومات کے ہجوم میں کھوئی ہوئی ایسی حقیقتوں کو بھی اپنی گرفت میں لے سکے جن تک عام لکھنے والوں کی نگاہ پہنچتی ہی نہیں۔اس لئے ہر اچھا خاکہ ایک دریافت ہوتا ہے کسی کہانی یا شعر کی طرح۔ہم اس کے واسطے سے زندگی کی کسی عام سچائی تک پہنچنے کے بعد یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سچائی کو ہم نے آج ایک نئے زاویے سے دیکھا ہے اور یہ کہ معنی کی ایک نئی جہت ہم پر روشنی ہوئی''۔ (حوالہ آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، مرتب پروفیسر شمیم حنفی، اردو اکادمی دہلی، 1991ء، ص10)

اچھے خاکے کی ایک خوبی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس میں شخصیت کے روشن وتاریک دونوں پہلوؤں کی جھلک دکھائی جائے۔ ورنہ پیش کردہ قلمی تصویریں یک رخی قرار پائیں گی۔ کیونکہ انسان نہ صرف اچھائیوں کا مرقع ہے نہ صرف برائیوں کا۔ ہرانسان میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں اور خامیوں کے ساتھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ خاکہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ شخصیت کو اس کی ساری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کرے۔اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ کمزوریوں کا براہ راست اظہار شخصیت یا اس کے مداحوں کی دل آزاری کا سبب بن سکتا ہے۔ اس لئے کمزوریوں کا اظہار ایسی ہنرمندی اور فنکاری سے ہونا چاہئے کہ شخصیت کی دل آویزی میں فرق نہ آنے پائے۔ کیونکہ کمزوریوں کے بیان کا مقصد شخصیت کی تحقیر وتذلیل نہیں بلکہ اس کی اصل فطرت کو آشکار کرنا ہے۔ یہ خاکہ کا انتہائی اہم اور نازک پہلو ہے۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو خاکہ نگاری ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ خاکہ نگار کو کمال درجے کا ادیب ہونا چاہئے۔ تب وہ اس کے ساتھ وفاداری کا سلوک کرسکتا ہے۔

اس کے علاوہ بعض مصنّفین کے خاکوں میں موضوع شخصیت کے بجائے خود خاکہ نگار کی شخصیت حاوی نظر آتی ہے جو خاکہ کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ خاکہ نگار کو جا بے جا اپنی شخصیت کی نمائش کے بجائے موضوع شخصیت کو ابھارنے پر توجہ دینی چاہئے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مصنف صیغہ واحد متکلم استعمال ہی نہ کرے۔جن واقعات کا وہ خود شاہد رہا ہو اس کے بیان میں اسکی اپنی شخصیت بھی منظر عام پر موجود رہے گی۔ کیونکہ اس کے بغیر شخصیت چلتی پھرتی نظر نہیں آئے گی اور خاکہ محض بیانیہ ہوکر عمومی مضمون بن جائے گا۔ مصنف کی شخصیت کے پس منظر میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قاری کی توجہ کا مرکز مصنف کے بجائے موضوع شخصیت کو ہونا چاہئے۔

☆☆☆

اعلان

لکھنؤ سے شائع ہونے والے سہ ماہی ادبی نشیمن کا اگلا شمارہ رباعی نمبر پر مشتمل ہوگا، تخلیق کاروں سے گزارش ہے کہ رباعیات سے متعلق اپنی تنقیدی تحقیقی اور تجزیاتی تحریریں درج ذیل ای میل آئی ڈی پر جلد سے جلد ارسال فرمائیں تاکہ رسالہ بروقت منظر عام پر آسکے۔

adbeenasheman@gmail.com

ادارہ

سوشل میڈیا سے

ایک شخص اپنے دوستوں کی محفل میں باقاعدگی سے شریک ہوتا تھا، اچانک کسی اطلاع کے بغیر اس نے آنا چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک انتہائی سرد رات میں اس محفل کے ایک بزرگ نے اس سے ملنے کا فیصلہ کیا اور اس کے گھر گئے۔وہاں انہوں نے اس شخص کو گھر میں تنہا ایک آتشدان کے سامنے بیٹھا پایا جہاں آگ جل رہی تھی، ماحول کافی آرام دہ تھا۔ اس شخص نے مہمان کا استقبال کیا۔ دونوں خاموشی سے بیٹھ گئے اور آتشدان کے آس پاس رقص کرتے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد مہمان نے ایک لفظ کہے بغیر جلتے انگاروں میں سے ایک کا انتخاب کیا جو سب سے زیادہ چمک رہا تھا۔اس کو چمٹے کے ساتھ اٹھایا اور ایک طرف الگ رکھ دیا۔ میزبان خاموش تھا مگر ہر چیز پر دھیان دے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں تنہا انگارے کا شعلہ بجھنے لگا تھوڑی سی دیر میں جو کوئلہ پہلے روشن اور گرم تھا اب ایک کالے اور مردہ ٹکڑے کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔سلام کے بعد سے بہت ہی کم الفاظ بولے گئے تھے۔ روانگی سے پہلے مہمان نے بیکار کوئلہ اٹھایا اور اسے دوبارہ آگ کے بیچ رکھ دیا فوری طور پر اس کے چاروں طرف جلتے ہوئے کوئلوں کی روشنی اور حرارت نے اسے دوبارہ زندہ کر دیا۔ جب مہمان روانگی کے لئے دروازے پر پہنچا تو میزبان نے کہا آپ کی آمد کا اور آپ کے اس خوبصورت سبق کے لئے بہت شکریہ میں جلد ہی آپ کی محفل میں واپس آؤں گا۔

☆☆☆

مشہور نقاد شاعر اور ادیب پروفیسر علیم اللہ حالی سے خالد عبادی کی گفتگو

مصاحبہ کار: خالد عبادی
سبزی باغ، پٹنہ۔ (موبائل: 9835480456)

خالد عبادی: اگر ہم ادب کے بارے میں بات کریں تو اسے کس طرح define کیا جائے گا؟

علیم اللہ حالی: ادب زندگی کی تلخیوں اور نارسائیوں سے نبرد آزما ہونے کا نام ہے۔ ادب کی مختلف شاخیں ہیں اور ہر شاخ اپنے اثرات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز بھی ہے۔ ادب انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی کی ناکامیوں کی تلافی کرتا ہے اور نامساعد حالات میں جینے کے اسباب پیدا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ادبی تخلیقات ہمارے لیے ایک نسخۂ کیمیا کا کام کرتی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ ایک ایسا معالجہ ہے جس سے تخلیق کار اور قاری دونوں مستفید ہوتے ہیں۔ جمالیاتی سطح پر ادب آبِ رکنا باد اور گل گشتِ مسلا کا سامان بھی فراہم کرتا ہے اور زندگی کے مکروہ احوال کو دیدہ زیب بنا دیتا ہے۔

> پروفیسر علیم اللہ حالی کا شمار ان نقادوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے پانچ دہائیوں سے زائد عرصے تک ادبی ریاضت کی ہے اور اس دورانیہ میں انھوں نے تین نسلوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اس لیے ان کی ہر بات ادبی دنیا میں غور سے سنی جاتی ہے۔ معروف شاعر خالد عبادی نے پروفیسر موصوف سے طویل گفتگو کی۔ ادبی نشیمن افتخار کے ساتھ یہ گفتگو اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔
>
> ادارہ

خ ع: اس وقت جب آپ لوگ پڑھ رہے تھے اور آج جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اس میں بنیادی فرق کیا ہے؟

ع ح: ادبی تخلیق اپنے عہد کے خارجی حالات سے متاثر ہوتی ہے۔ اسی لیے میں اکثر یہ کہتا ہوں کہ ادب اپنے عہد کے مزاج و انداز، معیار و میزان اور واقعات و سانحات کی معتبر تاریخ ہوتا ہے۔ اردو ادب بھی مختلف ادوار کی تصویریں بناتا ہے جس میں ہم متعلقہ دور کے خارجی وقوعوں کی جھلکیاں دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن اس بات کو نہ بھولیے کہ یہاں خارجی وقوعے ادب کی شعریات کے تحت بیان کیے جاتے ہیں۔ اس لیے ادب میں تاریخ تلاش کرنے کے لیے ایسے قاری کی ضرورت ہے جو اشارات و علامات سے حقائق دریافت کر لے۔ ادب کی تخلیق کا مواد سیاسی، تہذیبی، لسانی اور معاشی عوامل سے حاصل ہوتا ہے اور ادبی تخلیقات میں دل آویز صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اردو ادب کی تبدیلیوں پر غور کیجیے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی منزل وہ تھی جس میں اصلاحِ معاشرہ کے تصورات پیش کیے جاتے تھے۔ پھر اجتماعی شعور کی توسیع کی وجہ سے ترقی پسند شعر و ادب سامنے آئے۔ ترقی پسندی سے جدیدیت، مابعد جدیدیت اور پھر تازہ ترین رجحان جسے بے نام کہنا چاہیے، ادب میں باری باری سے آتا جاتا رہا ہے۔ ہم نے ترقی پسندی سے اس وقت ملاقات کی جب بنجارہ سارا ٹھاٹھ لاد کر لے جا رہا تھا اور جدیدیت اپنے لیے جگہ بنا رہی تھی۔ اس عبوری دور میں ادبی تخلیقات میں امتزاجی رویے کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔

خ ع: جدیدیت کے عہد میں کئی شاعروں، ادیبوں کا خوب خوب ذکر ہوا جن میں ظفر اقبال، محمد علوی، بانی، عادل منصوری، ساقی فاروقی اور ندا فاضلی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ کیا ہم انہیں ہی جدیدیت کا شاعر تسلیم کر لیں یا آپ کی نظر میں کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جن پر گفتگو ہونی چاہیے تھی جیسے مظہر امام، حسن نعیم، احمد مشتاق، خلیل الرحمن اعظمی، انور شعور، مظفر حنفی، لطف الرحمن اور سلطان اختر وغیرہ؟

ع ح: اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسندی کے انحطاط کے وقت خاص طور پر حلقۂ اربابِ ذوق کے پرورش یافتہ فن کاروں نے اپنے لیے الگ راستہ بنا لیا جس کے مسافروں میں وہ نام خاص طور پر آتے ہیں جن کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ میں اسما شماری کا قائل نہیں۔ اس لیے کہ اس میں کئی ناموں کے چھوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے اور اس طرح تخلیق کاروں کی حق تلفی ہو جاتی ہے۔ جدیدیت کا رجحان تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ آپ نے جن ناموں

کا ذکر کیا ہے ان کے علاوہ ہندو پاک میں کئی اور نام ہونے چاہئیں۔ اس جھمیلے سے الگ میں صرف اتنا کہوں گا کہ 1960ء کے آس پاس متعدد قلم کاروں کے نام تسلسل کے ساتھ آتے ہیں جنہوں نے ترقی پسند تحریک سے ہٹ کر شعر و ادب میں نئے امکانات کی طرف توجہ دی ہے۔ ترقی پسندی نے خارجی حقیقت نگاری پر زور دیا تھا لیکن اب بدلی ہوئی صورت حال میں تخلیق کار کی داخلی کیفیات کی ترجمانی ہونے لگی ہے۔ ترقی پسندی خارجی حقیقت نگاری کے سہارے زندہ تھی اور بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس تحریک نے اردو شعر و ادب کو بہت سے وقیع تخلیقات سے مملو کیا ہے۔ ترقی پسندی نے مشاہدے پر زور دیا اس کے جواب میں جدیدیت نے پیچیدہ محسوسات کے تحت ادبی تخلیق میں نئے امکانات پیدا کیے۔

خ ع: آپ خود ایک اہم شاعر و ادیب ہیں۔ شاعری، تنقید اور ادبی صحافت وغیرہ ان تمام شعبوں میں آپ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی آپ نے بڑی تعداد میں لکھی ہیں تو کیا ہم جان سکتے ہیں کہ آپ کی مستحکم شناخت کا اصل حوالہ کیا ہے؟

ع ح: آپ صحیح کہتے ہیں کہ میں نے خود بھی ادبی تخلیق کے نئے امکانات تلاش کیے ہیں۔ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ شاعری، تنقید اور ادبی صحافت کے حوالوں سے میں نے اپنے طور پر جو کام کیے ہیں ان کا صحیح جائزہ اور ان کی درجہ بندی کا حق تو قارئین کو ہے۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ میں نے اپنا سفر نظم نگاری سے شروع کیا۔ شمس الرحمن فاروقی کے رسالے 'شب خون' میں تواتر کے ساتھ میری نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ فاروقی صاحب نے 'شب خون' میں شائع شدہ منظومات کا ایک انتخابی مجموعہ 'نئے نام' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس میں بھی میری نظمیں منتخب کی گئیں تھیں اور یوں میری اولین شناخت نظم نگاری کے حوالے سے متعین ہوتی ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے غزل کے باب میں بھی میرا ذکر کیا ہے اور اسے میری پہچان بتایا ہے۔ بیس تیس برسوں میں جدید شاعر کی حیثیت سے میری شناخت بنتی رہی۔ تنقید اور ادبی صحافت کی منزل اس کے بعد آتی ہے۔ ان شقوں میں بھی میری خدمات کو متعدد ناقدین اور سنجیدہ قارئین نے قابلِ توجہ قرار دیا ہے۔

خ ع: پاکستانی ادب کے حوالے سے بھی کچھ سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ بہت سے لوگ پاکستانی شعر و ادب کو ہندوستانی شعر پر فوقیت دیتے ہیں۔ یہ بس ایک بے جا تاثر پذیری ہے یا واقعی ایسا ہے بھی؟

ع ح: یہ سوال بار بار اٹھتا رہا ہے۔ آج سے دو تین دہائی پہلے تک غزل گوئی کے حوالے سے پاکستانی شعرا کا گراف اوپر جا رہا تھا۔ تنقید کے ذکر میں ہندوستان مضبوط تصور کیا جاتا تھا۔ میرے بھائی اتنی آسانی سے ہندوستانی اور پاکستانی شعر و ادب کا مقابلہ کرنا مناسب نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تک جو لوگ پاکستان میں رہ کر ادب کی تخلیق کر رہے تھے وہ بنیادی طور پر ہندوستان سے ہی تخلیق کاری کا جذبہ اور حوصلہ لے کر گئے تھے۔ ستر پچھتر برسوں کے اس لمبے عرصے میں وہ ہندوستان سے ہی اپنی استعداد لے کر پاکستان گئے۔ وہاں کوئی ایسی کھیپ تیار نہیں ہوئی جس کو خالصتاً پاکستانی اہل قلم بتایا جائے۔ اب ان کے بعد پاکستان میں تخلیق کاروں کی جو جماعت تیار ہوئی ہے وہ آج ہندوستانی ادیبوں کے مقابلے میں آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے۔ ایک سرسری بیان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعری میں ہندوستانی ادیب پاکستانی قلم کاروں پر سبقت رکھتے ہیں اور نثری ادب میں پاکستانی ادبا آگے دکھائی دیتے ہیں۔ تنقید تو بہرحال ہر دور میں اور آج تک ہندوستانی ادیبوں کی معتبر پہچان رہی ہے۔

خ ع: ہندوستانی اور پاکستانی شعر و ادب کے مزاج و منہاج میں واقعی اگر کوئی فرق ہے تو اس کی بھی نشان دہی فرمائیں؟

ع ح: تخلیق خارجی حالات سے براہ راست متاثر ہوتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں جو تخلیقات سامنے آرہی ہیں ان سے ملک کے سماجی، سیاسی، تہذیبی، لسانی اور ثقافتی احوال مترشح ہوتے ہیں۔ اردو زبان کے ساتھ حکومت اور معاشرے کا جو رویہ ان دونوں ملکوں میں نظر آتا ہے وہ بھی ان کے شعر و ادب پر مرتسم ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ اثرات تخلیقی زبان کے فرق سے بھی ظاہر ہوجاتے ہیں۔ زبان کے زندہ رہنے اور اس کی توسیع و ترقی کے سلسلے میں تخلیق کاروں کو جن حالات سے گزرنا پڑتا ہے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ ملک کے حالات مسائل اور ان کے اثرات ہندوستان اور پاکستان میں سامنے آنے والے ادب سے براہ راست مربوط ہیں۔ ہندوستان میں اردو زبان کو زندہ رکھنے اور اس میں بہتر سے بہتر ادب پیدا کرنے کے سلسلے میں جس نبرد آزمائی کی ضرورت ہے وہ ادب کے معیار اور مزاج و منہاج کی آئینہ برداری کرتی ہے۔ پاکستان میں ادبا و شعرا کو اس کشاکش سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ ہندوستان میں اردو زبان کے خطوط و نقوش بھی کافی حد تک پاکستان سے

مختلف ہیں۔غرض ہندوستانی اور پاکستانی شعر و ادب کا مزاج سیاسی، سماجی اور لسانی مسائل متاثر ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے اسے صَرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

خ ع: ایک بات اور ہمارے یہاں بہت سے لکھنے والے ایسے تھے جنہیں ان کی موت کے بعد سرے سے نظر انداز کر دیا گیا۔ مصور سبزواری، حکیم منظور، فضا ابن فیضی، سہیل احمد زیدی، فاروق شفق، حمید الماس، باقر مہدی، محمود ایاز اور وحید اختر وغیرہ، کیا ایسا جان بوجھ کر کیا گیا یا یہ محض اجتماعی حافظے کے ضعف و کمزوری کا نتیجہ تھا؟

ع ح: یہ بات صحیح نہیں ہے کہ شعر و ادب کا مطالعہ کرنے والوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ کہ ہم بہت جلد اپنے فن کاروں کی خدمات کو فراموش کر دیتے ہیں ان معنوں میں قابلِ غور ہے کہ خود قلم کاروں کو اپنی جگہ بنانے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بقول غالبؔ

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

سچا اور اچھا فن کار اس امر کی توقع بھی نہیں کرتا کہ اس کی وفات کے بعد لوگ اسے کتنے دن تک یاد رکھیں گے۔ زندگی میں بہتر سے بہتر ادب پیدا کرنا اس کا کام ہے۔ وہ شہرت اور ناموری کے جھمیلے میں نہیں پڑتا۔ اپنی توفیق کے مطابق وہ جو کچھ لکھ سکتا ہے لکھ کر منظر نامے سے ہٹ جاتا ہے۔ اب یہ ذمہ داری بعد والوں کی ہوتی ہے کہ وہ ان فن کاروں کی تخلیقات کو کس طرح یاد رکھتے ہیں۔ ادب کے نام پر شعری و نثری اصناف میں تخلیق کردہ ہر فن پارہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہوتا ہے کہ بعد والی نسل اس کا مطالعہ کر کے اپنی تخلیقی صلاحیت میں وسعت اور تنوع پیدا کرتی ہے۔ مابعد کے تخلیق کار اپنے ناموں سے زندہ رہیں یا نہیں لیکن ان کے کامیاب کارنامے ہر عہد میں یاد رکھے جاتے ہیں اور آنے والی نسلیں ان سے روشنی اور توانائی حاصل کرتی رہتی ہیں۔

خ ع: عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ غزل گویوں کے مقابلے نظم نگاروں کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ یہ سلسلہ عمیق حنفی، وحید اختر، باقر مہدی، کمار پاشی، زبیر رضوی، وہاب دانش سے لے کر شاہد احمد شعیب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ خود آپ، لطف الرحمن، ظہیر صدیقی اور ارمان نجمی نے بھی عمدہ نظمیں لکھی ہیں لیکن ان کا ذکر بھی شاید و باید ہی کہیں دیکھنے کو مل پاتا ہے؟

ع ح: اردو شعر و ادب میں کئی بار نظم نگاری کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ ادب کے ناقدین نے غزل کی صنف میں بہت سی خامیاں تلاش کیں۔ اس کے باوجود نظم ہمارے تخلیقی مزاج میں غزل کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکی۔ اردو کی شاعری میں غزل کی شہرت اور مقبولیت دیکھ کر دوسری زبانوں کے فن کاروں نے بھی غزل کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنالیا۔ اس صورت میں اردو والوں کو اس لحاظ سے مطمئن تو ضرور ہونا چاہیے کہ اردو شاعری کی ایک صنف تو ایسی ضرور ہے جو دوسری زبانوں کے فن کاروں کو متاثر کرتی ہے۔

خ ع: تھوڑی سی بات اگر تنقید پر بھی کر لی جائے تو شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ اور وہاب اشرفی کے بعد تو گویا سناٹا ہی سناٹا ہے۔ قدوس جاوید اور علی احمد فاطمی کی تنقیدی تحریریں کچھ امید جگاتی ضرور ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ع ح: آپ نے پھر بخل سے کام لیا ہے۔ تنقید کے سلسلے میں صرف تین ناقدین کے نام لکھ کر آپ نے اردو میں تنقید کی توانا روایتوں کو محدود کر دیا ہے۔ جب کہ تنقید کی ایک بڑی مضبوط روایت موجود ہے اور ہر عہد میں شعر و ادب کی مختلف اصناف کے حوالے سے عمدہ کارنامے آتے رہے ہیں۔ ادبی تنقید ہم عصر ادبی رفتار و معیار پر منحصر کرتی ہے۔ اردو میں ہر صنفِ ادب کے سلسلے میں تشفی بخش تحریریں سامنے آتی رہی ہیں۔ آپ نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ شروع کی تنقیدی نگارشات میں مغربی اندازِ فکر اپنانے کی کوششیں کی گئیں۔ انگریزی اور جرمن زبانوں کی تنقیدی تھیوری ہمارے لیے پیش رفت کا کام کرتی رہی۔ لیکن جلد ہی ہم اپنی تہذیبی وراثت کی طرف راغب ہوگئے اور مغربی تنقیدی افکار کی خوشہ چینی سے آزاد ہوگئے۔ آزادی کا یہ تصور امداد امام اثر کی تحریر کی یاد دلاتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ کسی خطۂ ارض کے تہذیبی معاشرتی اور ثقافتی احوال تنقید کے رخ کو بھی متعین کرتے ہیں۔ تنقید تخلیقی تحریروں کی سمت کا جائزہ بھی لیتی ہے اور نئے لکھنے والوں کے لیے بھی راستہ ہموار کرتی ہے۔

خ ع: جہاں تک نئے شاعروں اور افسانہ نگاروں کا سوال ہے ان میں کچھ ناموں کا ذکر ہمارے نقاد کرتے ہیں تو ضرور ہیں لیکن ان کی اصل شناخت کیا ہے اور ادب میں ان کی کوششوں سے کس طرح کی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی ہے اس پر کم ہی روشنی ڈالی گئی ہے؟ اس صورت حال سے کیسے نکلا جاسکتا ہے؟

ع ح: نئے لکھنے والے اپنے طور پر مختلف اصناف ادب میں اپنے تجربات، افکار

اور احساسات پیش کر رہے ہیں۔ ایک جماعت قارئین کی بھی ہے جو کسی نہ کسی حد تک نئی تخلیقات کے خوب وزشت کو جائزہ لے رہی ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ متنی تنقید نقاد کے اپنے پسند و معیار کی آئینہ بردار ہوتی ہے۔ مثلاً کسی تخلیق کار کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہوئے نقاد اس کے خوب وزشت کا جو پیمانہ مقرر کرتا ہے اس سے اس کی اپنی شخصیت بھی جھلکتی ہے۔ کسی ناول پر کسی ایک شخص کا تاثر حتمی نہیں ہوتا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی تنقیدی تحریر کسی شاعر و ادیب کے کارنامے کا مکمل محاکمہ نہیں ہوتی۔ نئے لکھنے والے تخلیق و تنقید کے میدانوں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہ ان کا حق بھی ہے اور ان کی ذمہ داری بھی۔

خ ع: بہار کے حوالے سے بات کریں تو کبھی یہاں کے افسانہ نگاروں کا ایک غلغلہ سا تھا۔ سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، سید محمد محسن، شکیلہ اختر، الیاس احمد گدی، احمد یوسف، کلام حیدری، منظر کاظمی، ظفر اوگانوی، ان کے بعد آنے والوں میں بھی شوکت حیات، حسین الحق، شفق، عبد الصمد، رضوان احمد وغیرہ نے انمٹ نقوش چھوڑے لیکن آج جو چند لوگ اس صنف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں وہ اب تک اپنی شناخت قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ زبان و بیان کی کمزوری اور اخباری و عمومی موضوعات نے تو اس فن کی سطح اتنی پست کر دی ہے کہ چند نام لینے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے تو دائیں بائیں جھانکنے کی نوبت آپڑتی ہے؟

ع ح: یہ بات محل غور ہے کہ ماضی میں ریاست بہار کے افسانہ نگاروں کا غلغلہ سا تھا اور بہار کے چند افسانہ نگار (جن کے نام آپ نے لیے ہیں) کی کاوشوں کو حد درجہ سراہا جاتا تھا۔ اس کے بعد کے فن کاروں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے بہار کے چند تخلیق کاروں کے نام گنائے ہیں۔ یہ افسانہ نگار عصری اعتبار سے موجودہ عہد کے تخلیق کار کہے جا سکتے ہیں ان کے بعد والی نسل ابھی ناپختہ ہے لیکن برسرِ عمل ہے۔ یہ نئے لوگ اپنے طور پر مصروف کار ہیں اور تخلیق کاری کے قافلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ شروعِ سفر میں ان کے سلسلے میں کوئی حتمی جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔

خ ع: شعری منظر نامہ کے معاملے میں صورت حال البتہ کافی مختلف ہے۔ ادبی منظر نامہ پر ۸۰ کے بعد سامنے آنے والے شاعروں میں بہار کے شاعر ہی سرفہرست ہیں۔ آپ ذاتی طور پر ان کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور کیا ان میں چند کے نام ترجیحی بنیاد پر لینا پسند کریں گے؟

ع ح: آپ کا خیال ہے کہ بہار کے شعری منظر نامے میں جو تخلیق کار نظر آتے ہیں ان سے اچھی شاعری کی توقع کی جا سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن چند ناموں کے ذکر سے ان تخلیق کاروں کو تکلیف ہو سکتی ہے جو اپنے طور پر بہتر سے بہتر لکھنے میں کوشاں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ادب میں نثری و شعری تخلیقات کے حوالے سے جو نام لیے جا سکتے ہیں ان میں صوبہ بہار کی حصہ داری اطمینان بخش ہے۔

خ ع: سہ ماہی 'انتخاب' جو آپ کی ادارت میں ایک خاص اہتمام سے نکل رہا تھا اس کے اچانک بند کرنے کی وجہ کیا ہوئی؟

ع ح: 'انتخاب' جو میں اپنے محدود وسائل کے باوجود کئی برسوں سے شایع کر رہا ہوں ادھر اس کی اشاعت التوا میں پڑ گئی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اب مجھ میں اتنی توانائی نہیں رہی کہ میں اس کی ساری ذمہ داریاں سنبھال سکوں۔ اگر کوئی باذوق ادب نواز کی شرکت اور معاونت مل جائے تو 'انتخاب' کو تسلسل کے ساتھ شائع کیا جا سکتا ہے۔

خ ع: اس وقت آپ کی مصروفیات کیا ہیں اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے تحت عنقریب کس طرح کی کتابیں اور تصنیفات منظر عام پر آنے والی ہیں؟

ع ح: شاعری (تخلیق اور مطالعہ دونوں)، خودنوشت سوانح حیات اور نئے قلم کاروں کے مسودات پر پیش لفظ لکھنے میں مصروف ہوں۔ عمر کی اس منزل اور صحت کی خرابی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی بڑا کام کر سکوں۔

خ ع: نئے لکھنے والوں اور تازہ واردانِ ادب کی رہنمائی کے لیے اگر آپ کچھ کہنا چاہیں تو یقیناً یہ آپ کی بڑی عنایت ہوگی۔

ع ح: نئے لکھنے والوں کی ذمہ داریاں پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہوگئی ہیں۔ اس لیے کہ اگر تخلیق کار ماقبل کی ادبی تحریروں کا مطالعہ نہ کرے تو اچھا اور بہتر ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔ آج لکھنے والے تو جو لکھ سکتے ہیں لکھ لیتے ہیں لیکن پڑھنے سے گریز کرتے ہیں۔ اردو میں Reading culture بری طرح کمزور ہو گیا ہے۔ نئے لکھنے والوں کی بہتر کامیابی اس بات میں ہے کہ وہ ہر عہد کی نمائندہ تخلیقات کا مطالعہ بھی کرتے جائیں۔ ہمارے یہاں شوق و ذہانت دونوں کی کمی نہیں۔ نوجوان نسل ماضی کے کارناموں سے اپنی تخلیقی توانائی بڑھا سکتی ہے۔ بس غالبؔ کے اس شعر کو یاد رکھیں اور اس پر عمل کریں:

بے منتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

خ ع: اپنی مصروفیات میں سے اتنا قیمتی وقت دینے کے لئے بہت بہت شکریہ۔

☆☆☆

غزل

زباں سے کچھ نہ کہا داستان چھوڑ گیا
وہ جاتے جاتے بھی کیا کیا گمان چھوڑ گیا
یوں آج مجھ کو مرا مہربان چھوڑ گیا
نہ کچھ کہا نہ سنا بے زبان چھوڑ گیا
جو بدلا وقت کا تیور تو ایک لمحے میں
وہ ساری عظمتیں اور آن بان چھوڑ گیا
جسے میں پڑھ نہ سکا آج تک محبت میں
وہ میرے دل پہ اک ایسا نشان چھوڑ گیا
نہ اس کی یاد ہے، غم ہے، نہ اس کا نقش کوئی
وہ میرے قلب کا خالی مکان چھوڑ گیا
زمین اوڑھ کے مفلس تو سو گیا لیکن
سروں پہ بچوں کے بس آسمان چھوڑ گیا
نہ راستہ ہے نہ منزل نہ راہبر کوئی
یہ لا کے مجھ کو کہاں مہربان چھوڑ گیا
چمک رہا تھا جو مدت سے آج وہ اخترؔ
فلک سے ٹوٹ کے اپنا جہان چھوڑ گیا

ڈاکٹر اختر ریاض
گولف سٹی، لکھنؤ
موبائل: 9918226052

غزل

جانے دیں گے نہ تجھے ایسے کنارہ کرکے
ہم منالیں گے تجھے اپنا خسارہ کرکے
اپنی امید کا ہر پھول سجائیں گے یہاں
نقش محبوب کو قسمت کا ستارہ کرکے
کیا بتائیں کہ ہے لطفِ تمنا یاروں!
پھول کھلتے ہیں خوشی کے جو نظارہ کرکے
ناخدا بن گئے اک ڈوبتی کشتی کے لئے
تیرے دو لفظ محبت کا اشارہ کر کے
چاہے جس حال میں رکھو ہمیں رہنا ہے یہیں
ہم کہاں جائیں گے اب تم سے کنارہ کر کے
پہلی فرصت میں ہی انکار کیا جانا تھا
آج مشکل میں ہے اس کو گوارا کرکے
کوششیں ہوگئیں سب رائیگاں
اپنی عامرؔ وقت نے چھوڑ دیا ہم کو تمہارا کرکے

عامر قدوائی
کویت
موبائل: 96566278931

غزل

مدت سے میں تپتے ہوئے صحرا میں کھڑا ہوں
تاحدِ نظر سایہ کوئی ڈھونڈ رہا ہوں

یا اتنا اٹھا میں کہ سرِ دار چڑھا ہوں
یاسنگِ گراں بار سرِ راہ پڑا ہوں

ہیں میں میرے تعاقب میں کئی چیختے لمحے
کیا جانے کہاں خود کو لئے بھاگ رہا ہوں

ہوں صفحۂ دنیا پہ میں تصویر کی صورت
دیکھو جو ذرا غور سے خاموش صدا ہوں

لوٹ آئی پلٹ کر جو سرِ عرش بریں سے
میں نکلی ہوئی دل سے وہ ناکام دعا ہوں

یہ بے خبری کیسی ندیمؔ آج ہے طاری
خود مجھ کو پتہ کچھ نہیں میں کون ہوں کیا ہوں

شعیب ندیم گورکھپوری
خونی پور، گورکھپور
موبائل: 8565876007

غزل

مصلحت سے بھی ہے آدمیت بڑی
کیوں پسِ پُشت ہے یہ حقیقت بڑی

موتیوں کے خزانے کے در کھُل گئے
آنکھ دکھلا رہی ہے سخاوت بڑی

آ گیا سامنے پھر وہی مسئلہ
خوش گمانی بڑی یا مشیّت بڑی

پوچھتے کیا ہو تفسیرِ سوزِ دروں!
وقت ہے مختصر اور حکایت بڑی

ابلقِ روز و شب سے ٹھَنی جانے کب
عمر کے رخش کو بھی ہے عجلت بڑی

میں شہادت طلب، خون آشام وہ
منحنی آرزو اور عنایت بڑی

تیری شرمندگی تجھ پہ ہے خندہ زن
تیغِ نفرت بڑی یا محبت بڑی

کیا ہو جدّت کے خط کا، اگر روبرو
کھینچ دے وقت سطرِ روایت بڑی

تیری اُفتادِ طبع اثرؔ مرحبا!
نکتہ سنجی کی ہے قدرو قیمت بڑی

مرغوب اثر فاطمی
روڈ نمبر ے، محلہ علی گنج، گیا (بہار)
موبائل: 9431448749

غزل

وہ میری آنکھوں میں اک انتظار چھوڑ گیا
خزاں رسیدہ چمن میں بہار چھوڑ گیا

یہ غم نہیں کہ ثمر سے وہ رہ گیا محروم
بہت ہے خوش کہ شجر سایہ دار چھوڑ گیا

دعا کے سائے میں تھا جس ضعیف ماں کی وہ
نہ جانے کیسے اسی کا دیار چھوڑ گیا

رفاقتوں کا مری جس کو تھا بھرم رکھنا
وہ عمر بھر کے لیے اشک بار چھوڑ گیا

جو خود کفیلی کا سب کو ہنر سکھاتا تھا
وہ راہِ صبر میں دکھ کا غبار چھوڑ گیا

سمجھ نہ پایا جو ثمرین شاعری کا مقام
وہ کیسے چشمِ غزل میں خمار چھوڑ گیا

صائمہ ثمرین
جواہرلعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

غزل

تجھ سا یوں بے خبر نہیں دیکھا
لوٹ کے اک نظر نہیں دیکھا

وہ دکھائی نہیں دیا مجھ کو
اسکو میں نے کدھر نہیں دیکھا

ہم نے دیکھے حسین لاکھوں ہیں
کوئی تم سا مگر نہیں دیکھا

بات پہ اپنی میں تو قائم ہوں
پھر پلٹ کے ادھر نہیں دیکھا

موت تھی سامنے مگر پھر بھی
آنکھ میں اسکی ڈر نہیں دیکھا

عشق کا درد بھول جائے جو
تجھ سا کوئی ظفر نہیں دیکھا

ظفر صدیقی
(لکھنؤ)

نظم

قلم تیز تر از تیغ

سب پہ حاوی قلم کی طاقت ہے
اس کی لیکن ، کٹھن حفاظت ہے
وہ قلندر ہے اس زمانے کا
جس کو سچی قلم سے نسبت ہے
بندہ محتاج وہ نہیں ہوگا
پاس جس کے قلم کی دولت ہے
تیز تلوار سے بھی ہے زیادہ
یہ قلم کی وقیع ندرت ہے
دکھ تو یہ ہے، قلم قلم نہ رہا
دور حاضر کی یہ عنایت ہے
بیچتے ہیں جو یاں قلم، اپنا
یہ حماقت ہے، یہ جہالت ہے
کوئی ناراض ہو تو ہو انجم
سچ ہی لکھنا، ہماری فطرت ہے

فریدہ انجم
(پٹنہ سٹی)
موبائل:8235851828

نظم

عورت

ہم عورت ہیں، ہے اس پر فخر ہم کو
کبھی نہ توڑ پایا جبر ہم کو
کبھی نہ ہار پائیں حوصلہ ہم
اسی خاطر ملا ہے صبر ہم کو
تپش سہنے کی طاقت دی ہمیں پھر
بنایا سب کی خاطر اَبر ہم کو
ہم اپنے ولی و وارث تو خود ہیں
کرو نا تم کسی کی نذر ہم کو
دیئے دنیا میں اتنے امتحاں ہیں
نہیں خوفِ صراط و حشر ہم کو
نئی ہر زندگی کو سینچتے ہیں
نہیں ملتا ہے پھر بھی اجر ہم کو
ہیں گل ہم پیار کی نکہت بکھیریں
کرو نا اس قدر بے قدر ہم کو

یاسمین حسین زیدی نکہت
(سڈنی، آسٹریلیا)

میری ماں

مری ان پڑھ ہے ماں لیکن
کتاب جاں وہ پڑھتی ہے
وہ دنیا کو سمجھتی ہے
بہت حیران ہوتی ہے
مگر خاموش رہتی ہے
اسے معلوم ہے مشکل
مگر مشکل سے لڑتی ہے
وہ دنیا دنیا کہتی ہے
مگر دنیا سے بچتی ہے
مجھے سمجھاتی ہے دنیا
اگرچہ دور رہتی ہے
جھمیلوں سے، تماشوں سے
عداوت سے بغاوت سے
مری ان پڑھ ہے ماں لیکن
کتاب درد پڑھتی ہے
میری چاہت سمجھتی ہے
وہ گھر کا کام کرتی ہے
بہت مصروف رہتی ہے
مگر وہ پاس آتی ہے
وہ آ کر بیٹھ جاتی ہے
کبھی بازی لگاتی ہے
مگر وہ ہار جاتی ہے
کہ مجھ سے ہارنے میں ہی
خوشی ملتی ہے، راحت بھی
مری ان پڑھ ہے ماں لیکن
مری آنکھوں کو پڑھتی ہے
محبت مجھ سے کرتی ہے
ذرا سی دھوپ میں بھی وہ
مجھے آنچل سے ڈھکتی ہے
یہ اس کا پیار، قربانی
کہ شب میں سو بھی جاؤں تو
مجھے وہ دیکھنے آئے
تسلی پھر بھی نہ آئے
مجھے سردی کے موسم میں
رضائی سر پہ ڈھک جائے
مری ان پڑھ ہے ماں لیکن
مجھے جینا سکھاتی ہے
بہت رشتہ نبھاتی ہے
میں گھر سے جب نکلتا ہوں
نظر میری اتارے بھی
دعائیں وقت رخصت بھی
بلائیں وہ بھگائے بھی
اگر بیمار پڑتا ہوں
دوا جب دیر کرتی ہے
اثر میں تو وہ گھبرائے
کبھی دالان میں جائے
کبھی آکاش کو دیکھے
مجھے جب نیند نہ آئے
وہ نیندوں کو چرا لائے
کبھی سجدے میں کھو جائے
کبھی آنکھوں کو وہ چومے
کبھی جھولا جھلا جائے
کبھی مجھ کو ہنسا جائے
مگر جب پوچھتی ہے وہ
مرے بیٹے تو کیسا ہے
تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
مری ماں بیٹھ جاتی ہے
مجھے ہر پل وہ تکتی ہے
دعا میں مجھ کو رکھتی ہے
وہ کھانا بھول جاتی ہے
وہ سونا بھول جاتی ہے
مری ان پڑھ ہے ماں لیکن
مرے چہرے کو پڑھتی ہے
مری دھڑکن سمجھتی ہے
مرا بستہ اٹھاتی ہے
مرے مکتب کو جاتی ہے
مجھے رکشے میں لاتی ہے
مجھے پڑھنا نہیں آتا
مجھے لکھنا نہیں آتا
مگر کوشش وہ کرتی ہے
مجھے چلنا نہیں آتا
مگر چلنا سکھاتی ہے
مری ان پڑھ ہے ماں لیکن
زبانی یاد ہے جتنا
کلام اللہ پڑھتی ہے
عبادت کرتی رہتی ہے
بہت سی خوبیاں اس میں
محبت کی حلاوت کی
کرامت کی شجاعت کی
سخاوت کی رفاقت کی
نزاکت کی صباحت کی
اطاعت کی شرافت کی
علامت بھی روایت بھی
وہ اک ایسی دوائے جاں
ملے منٹوں میں راحت بھی
فرشتہ بھی ہے میری ماں
مگر واقف نہیں اپنے
وہ بال و پر کی وسعت سے
صداقت کی صداقت سے
عنایت کی عنایت سے
مری ان پڑھ ہے ماں لیکن
خدا سے اس کی نسبت ہے
کبھی تسبیح پڑھتی ہے
کبھی وہ ورد کرتی ہے
وہ راز رب سمجھتی ہے
وہ جو روٹی پکاتی ہے
مجھے پہلے کھلاتی ہے
اگر بچ جائے روٹی تو
وہ باسی خود ہی کھاتی ہے
مجھے تازہ کھلاتی ہے
میری روٹی کو گنتی ہے
تو گنتی بھول جاتی ہے
میری ان پڑھ ہے ماں لیکن
کتاب درد پڑھتی ہے
بہت آنسو بہاتی ہے
مگر وہ مسکراتی ہے
مرے ہر عیب سے واقف
مگر سب سے چھپائے بھی
مرے ہی واسطے پیسے
وہ جو پلو میں باندھے بھی
ضرورت پڑنے پر اکثر
مجھے رستہ دکھائے بھی
بڑا تو ہو گیا پھر بھی
مجھے بچہ سمجھتی ہے
مری آواز سنتی ہے
مری ان پڑھ ہے ماں لیکن
مرے خوابوں کو پڑھتی ہے
مری تعبیر بنتی ہے
میری ان پڑھ ہے ماں لیکن
مری سانسوں کو پڑھتی ہے
مری راتوں کو پڑھتی ہے
مری باتوں کو پڑھتی ہے
مری ان پڑھ ہے ماں لیکن
صدف مجھ سے زیادہ وہ
مجھے مجھ کو سمجھتی ہے

مشتاق صدف ویزیٹنگ پروفیسر، تاجک نیشنل یونیورسٹی، دوشنبہ، تاجکستان

قطعات

سختیاں ساری ایجاد کی جائیں گی !
ایک عاشق کے حق میں سزا کے لئے
اہلِ دل راہ مقتل سے آگے بھی اب !
باوضو ہو کے دیکھیں خدا کے لئے

مری محنت کی ہرلمحہ گواہی !
خود اپنے آپ سے خلوت میں لیں گے !!
خدا کا شکر ہے میں مطمئن ہوں !
مرے بچے مجھے دھوکہ نہ دیں گے !!

سانسوں کے اس سوندھے پن کی فطرت میں
جیون کی رت اپنے رنگ ملاتی ہے
بے چینی، راحت،خوشیاں اور غم جیسے
دل کی دھرتی سارے روپ کھلاتی ہے

خدا شاہد ہے اے میرے مسیحا !
مسیحا سے ہوں تیری میں بدظن !!
مری غزلیں مکمل ہوں گی کیسے !
اگر کر لوں میں دردِ دل سے ان بن !!

میں نے مشکل سے ندامت پہ ندامت کر کے!
زندگی جینے کے انداز کو اسان رکھا !!
خوب روشن ہو دن رات مرے! جب میں نے!
دل کے جزداں میں ترے نام کا قران رکھا!!

چراغوں سے تو ہے محروم لیکن
اندھیرا طاق تک پہنچا نہیں ہے
یہ سچ ہے آج تک کو منافق
مرے اخلاق تک پہنچا نہیں ہے

وہ بھی پتھر سی بات سہتے ہیں
جن کو پھولوں سے چوٹ لگتی ہے
کتنے آتش فشاں چھپائے ہوئے
جھیل اندر سے بھی سلگتی ہے

کون کیسے ہوا کہاں داخل
بحث یہ روز چھوٹ جاتی ہے
دن کے مصداق شور و شر سن کر
رات کی نیند ٹوٹ جاتی ہے

چراغِ دل اسکا بے سبب ہی
حسد کی آندھی میں گھر گیا تھا
خود اپنی نظروں میں میرا بھائی
مجھے گرانے میں گر گیا تھا

دماغ اپنا ٹھکانہ ڈھونڈھ لیتا
غزل کو دل سے گڑھنا چاہئے تھا
تمھیں پڑھتے ہوئے ہم سوچتے کیوں
ہمیں کچھ اور پڑھنا چاہئے تھا

دل کو جیسے بھی ہو بہلا دیتے ہیں
ہنستے، ہنستے، گاتے، گاتے روتے ہی
گھر کے سناٹے بھی شور مچاتے ہیں
بچوں کی اسکول سے چھٹی ہوتے ہی

ہزار رات کے قصے ہزار شعروں میں
سنا سکے جو کسی کو وہی سنایا ہے
خدا گواہ ہے مصداق اعظمی ہم نے
غزل کی آڑ میں کچھ بھی نہیں چھپایا ہے

میری آمد پہ بھی گزارش ہے
تھوڑا اٹھئے جناب کرسی سے
عین ممکن ہے کچھ نکل آئے
میری تکبندیوں کی گٹھری سے

میں بھی رنج و ملال کے قصے
خود سناتے ہوئے بکھر جاؤں
اپنے چہرے کو بھیگی پلکوں سے
آئینہ دیکھ لوں تو ڈر جاؤں

مصداق اعظمی مجواں، اعظم گڑھ۔موبائل:9451431700

اردو

صدف جمال
محمود آباد، بارہ بنکی، اتر پردیش

آزادی کے بعد اس جمہوری ملک میں سب سے زیادہ اردو تعصب کا شکار ہوئی اور اردو کو ایک آنکھ سے دیکھا جانے لگا جس طرح ہمارے معاشرے میں سگی اولاد کی تو بڑی محبت وشفقت سے پرورش کی جاتی ہے لیکن سوتیلی اولاد کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کچھ ایسا ہی رویہ اردو کے ساتھ اختیار کیا گیا۔ اس طرح اردو نفرتوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ایک طرف وہ قوم جس نے دنیا کو چکبست، گلزار اور پریم چند جیسے نایاب گوہر دیئے، اس نے اردو سے ایک الگ ہی بیر رکھ لی تو دوسری طرف اردو والوں نے بھی اس زبان کا حق ادا نہیں کیا۔ اس طرح ہماری مادری زبان پڑھے لکھے طبقے تک ہی محدود ہو کر رہ گئی اور عام آدمی کی پہنچ سے دور ہو گئی۔ ہم اردو کو بھول کر دوسری زبانوں کے سہارے جینے لگے، کسی غیر ملکی زبان کی چاہت اور کشش نے ہمیں اپنی زبان سے بیگانہ کر دیا اور ہم ہماری تہذیب سے دور ہوتے چلے گئے۔

ہماری نئی نسل تو اپنی زبان سے اس قدر لاتعلق ہو گئی کہ شاید ہی کوئی قوم اپنی زبان سے ہوئی ہو۔ ہم نے شادی اور سادی کے فرق کو مٹا دیا، عزت کو عجت کہہ کر عزت کی مٹی پلید کر دی۔ سین شین، زے، ذال، اور جیم سب کو ایک کر دیا۔ آج ہم اردو املا اور تلفظ تو دور، اردو لکھنا پڑھنا تو درکنار، الف سے جیم تک کے ہجے کا سفر طے کرنے سے قاصر ہیں۔

جہاں دوسری قومیں اپنی اپنی زبانوں کے فروغ کے لیے ہمیشہ سے گامزن رہیں، وہیں ہم نے اردو کو کتابوں میں بند کر کے رکھ دیا اور اس طرح ہم اپنی ہی تہذیب کا قلعہ اپنے ہی ہاتھوں سے مسمار کرنے پر اتر آئے اور ہماری پہچان ہمارے ہاتھوں ہی پامال ہونے لگی۔ اردو کی مثال اس پرانے گھر جیسی ہو کر رہ گئی جس میں رہنے والوں نے عرصہ پہلے اس میں تالا ڈال دیا ہو؛ یہاں تک اس گھر کے ساز وسامان، میز، کرسی اور فانوس دھول سے دب کر گرد وغبار سے بند ہو گئے ہوں اور گھر پر پڑے تالے نے اپنا رنگ بھی بدل لیا ہو؛ جب کہ اردو تو اس عطر کی مانند ہے جو باغیچے میں موجود مختلف رنگ وبو کے پھول کے عرق کو نچوڑ کر بنائی گئی ہو جس کی خوشبو فضا کو معطر کر کے اس میں سانس لینے والوں کو مدہوش کر دیتی ہو۔ اردو تو سمندر کے بیش قیمت موتیوں کی خوبصورت لڑی کی طرح ہے جو نیلم، عقیق، روبی، ہیرا، زمرد اور پکھراج جیسے انمول پتھروں کی روشنی کو ایک جگہ سمیٹ کر بیٹھی ہوئی ہے۔ قوسِ قزح کے سات رنگوں کا مجموعہ اردو ہے۔ اردو، جھرنے سے گرنے والے شفاف پانی کی طرح ہے، اردو کی مثال سرخ گلاب کے گجروں کی سی ہے، اردو مالا میں پروئے بیلے کی طرح ہے، ،اردو سرخاب کا پر ہے جسے قدرت نے بڑی نزاکت سے سنوارا ہے۔ اردو، وہ آئینہ ہے جسے دیکھ کر حسن سجتا سنورتا ہے۔ اردو، وہ سہرا ہے جو دلہے کے سر پر بڑے ارمانوں سے سجتا ہے۔ اردو، وہ شے ہے جس پر ماں نے اپنے پاک ہاتھوں سے محبت کے رنگ چڑھائے ہیں، بے چین دل کو راحت بخشنے والی شربت اردو ہے۔ اردو، چودھویں کے چاند کی وہ روشنی ہے جس کے اجالے میں اہل ادب لفظوں کے موتی پروتے ہیں۔ اردو ستاروں کے جھرمٹ سے نکلنے والا دلکش نظارہ ہے، اردو وہ شمع ہے جس کے ہم پروانے ہیں، اردو شام کی شفق ہے، اردو مثل زعفران ہے،، اردو بادصبا ہے، اردو عشق کی وہ کیفیت ہے جس کا اسیر ہر محبت کرنے والا دل ہے۔ اردو وہ سحر ہے جس میں ایک بار آجانے والا نا نکل سکتا ہے نا نکلنا چاہتا ہے۔ اردو امیر خسرو کی وہ درسگاہ ہے جس میں آنے کے لیے غالب نے بھی جوتے اتارے تھے، اردو وہ مکتب ہے جس میں آ کر کوئی میر بن گیا تو کوئی داغ کہلایا۔ اردو، کبھی بہادر شاہ ظفر کے شاہی دربار کی زینت رہی تو کبھی ان کے اکیلے پن کی ساتھی رہی۔ اقبالؔ کا اقبال بلند ہوا تو اردو سے، ذوقؔ کا مذاق سنورا تو اردو سے۔ خمارؔ کا خمار اترا تو اردو سے۔ فیضؔ کا فیض پہنچا تو اردو سے۔ پروین شاکر کے لفظوں کی مہک پھیلی تو اردو سے۔ ادا جعفری کے کلام کی خوشبو بکھری تو اردو سے، جونؔ کا دیوانہ پن لوگوں کر سر چڑھ کے بولا تو اردو سے۔ دلی کے در و دیوار اردو اردو بولتے ہیں تو لکھنو کی شام کی رنگینی کا باعث اردو ہے۔ حیدرآباد کی شرافت اردو کی مرہون منت ہے تو لاہور کی پہچان اور کراچی کی ضیافت کا دم خم اردو سے ہے۔ اردو بولنے والا پرانے کرتے اور پھٹے جوتوں میں بھی اہل محفل کی جان ہے۔ اردو وہ شجر ہے جس کا ثمر ادب، جس کی شاخیں شرافت، جس کی بنیاد محبت ہے اور جس پر باادب پرندوں کا بسیرا ہے۔ اردو بولی جائے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں، اردو سنی جائے تو

کانوں میں رس گھلتا ہے، اردو پڑھی جائے تو قلب مطمئن ہوتا ہے۔

اردو وہ بستی ہے جس میں رہنے والوں کی آنکھوں میں چمک ہے، چہرے پر پاکیزگی اور کردار میں وقار ہے، ماحول میں خوشبو ہے۔ رشتوں میں احترام اور دلوں میں الفت ہے، اردو کے سر پر اہل جنت کی زبان کا سایہ ہے، اردو کی ہمشیرہ فارسی، ہندی اور سنسکرت ہے۔

اردو امن اور بھائی چارے کی زبان ہے، اردو خوشگوار فضا ہے، جیسی چاند سے چکور کو چاہت ہے ویسی ہی ہندوستانی تہذیب کے دلدادگان کو اردو سے محبت ہے، اردو کسی ضعیف العمر خاتون کے سرمے کی طرح ہے جو اس کی کمزور آنکھوں کو طاقت دیتا ہے، ہماری تہذیب کی بقا اردو ہے، اردو زبان ہی نہیں؛ بلکہ ہماری پہچان ہے، اردو دل کی زبان ہے، اردو سے ضیا ہے، اردو ہمارا معیار ہے، اردو ایک کشش ہے جس کی طرف سب کھنچے چلے آتے ہیں۔

اردو سے نفرت کرنے والوں کی مثال اس کاوں کاوں کی سی ہے جو اپنی آواز کو بلبل کی چہچہاہٹ سے، اپنے رزق کو ہنس کے رزق سے، اپنی چال کو مور کی چال سے اور اپنی نظر کو عقاب کی نظر سے بہتر سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے اور آج جب اردو خستہ حالی کے دور سے گزر رہی ہے تو ہر محب اردو پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان کی بقا اور تحفظ کے لئے اقدام کریں۔ اردو کے فروغ کے لیے آگے آئیں۔ مادری زبان کی قدر و قیمت نوجوان نسل کو بتائیں؛ ورنہ وہ وقت دور نہیں جب ہم پیوندِ خاک اور ہماری زبان تاریخ کے اوراق میں گم ہو کر رہ جائے گی اور ان اوراق کو پلٹنے والا بھی کوئی موجود نا ہوگا۔

☆☆☆

کل ہماری باری ہے

ڈاکٹر سلیم احمد

وہ روتے ہوئے دنیا میں پیدا ہوا
کبھی بھوک سے روتا، کبھی تکلیف سے روتا اور کبھی ماں کی گود کے لیے روتا
اب سمجھ دار ہو گیا تھا
اپنی ہر خواہش اور مطالبات ماں سے رو کر پورا کرا لیتا
ماں کی ممتا اسے پورا کرنے پر مجبور کر دیتی
پڑھائی مکمل ہو چکی تھی

اب رونا تھا تو روزی روٹی کا، نوکری کا، رشوت کے لیے پیسے کا، گاڑی میں پٹرول کا، بڑھتی ہوئی مہنگائی کا، سماجی منافرت کا، گندی سیاست کا، لاچاری اور مجبوری کا۔۔۔۔ وغیرہ۔ ماں کے انتقال پر تو خوب رویا بے حد خوش گوار ماحول میں شادی کا دن اور تاریخ بھی طے ہو گئی

بارات دھوم دھام سے لڑکی والے کے دروازے پہنچی، تمام رسومات اور مغموم فضا میں رخصتی بھی ہو گئی، یہ پہلا موقع تھا جب وہ نہیں رویا بلکہ وہ بہت خوش تھا، مگر اس کے بعد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ماں کے بعد اس پر رونے والا کوئی نہیں تھا

ریٹائرمنٹ کے بعد اچانک اس کے اندر تبدیلی پیدا ہو گئی، اب وہ صرف اللہ کے لیے روتا تھا، وحدہٗ لاشریک لہٗ کے لیے روتا تھا، روتا تھا وہ اپنی عاقبت کو سنوارنے کے لیے، مغفرت اور قبر کے خوفناکی کے ڈر سے روتا تھا۔

اچانک باہر ہلچل ہوئی لوگ جب تک کچھ سمجھ پاتے سرکاری بلڈوزر حرکت میں آ چکا تھا۔

مکان، دکان، ٹھیلے، عبادت گاہیں بلڈوزر کی زد میں تھے۔

زندگی بھر جوڑ جوڑ کر بچائے گئے پیسے سے کسی طرح سر چھپانے کے لیے ایک چھوٹا سا گھر بنایا تھا جو پل میں آنکھوں کے سامنے زمیں دوز ہو گیا۔ سب بے بس اور مجبور تھے۔ اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ بہت سے لوگ تھے اس کے ساتھ رونے والے۔ وہ دور کھڑا بے بس اور لاچار اپنے منہدم ہو رہے گھر کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کبھی لاؤڈ اسپیکر پر پابندی، کبھی کھلے میں نماز پڑھنے پر پابندی، تو کبھی خانے اور کپڑا پہننے پر پابندی طرح طرح کے طفلانہ سوال کھڑے کرنا، لوگوں کے جذبات کو ہوا دینا اور گرم توے پر سیاست کی روٹی سیکنا۔

تبھی کچھ نوجوانوں کا ہجوم اس کی طرف بڑھا، نام پوچھا اور حملہ کر دیا یہ دہشت گرد تھے جسے ہم انتہا پسند کہتے ہیں اور ان کے ذریعہ کیے گئے حملے کو ماب لینچنگ کہا جاتا ہے، اب اس پر رونے والا تو کوئی نہیں تھا مگر اس کے رونے کی آواز اب پورے ملک میں بے بس اور فرقہ فرقہ کھیل رہی قوم کی کانوں میں گونج رہی تھی۔ یہ آگہی تھی۔ جس میں آنے والے وقت اور حالات کی بے حد خوفناک گونج شامل تھی۔ اخبار کی سرخی پڑھ کر۔۔۔۔۔۔ لگتا ہے بریلوی مسلک کا ہے۔ نہیں نہیں ارے میں اچھی طرح جانتا ہوں یہ وہی جماعت والا دیوبندی ہے۔ تبھی فضا میں دور سے ہلکی ہلکی آواز۔۔۔۔۔ ''موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے'' کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔ (شوق لکھنوی)

☆☆☆

'بالاسور' یاترا

ڈاکٹر مجاہد الاسلام
اسسٹنٹ پروفیسر، مانو لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ۔ (موبائل: 9628845713)

اڈیشا اردو اکادمی کی طرف سے 'بالاسور' میں منعقد ہونے والے قومی سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو اس شہر کے تعلق سے قومی اخبارات میں چھپنے والی خبریں یاد آتی چلی گئیں۔ یہ ہندوستان کے مشرقی گھاٹ کی پہاڑیوں پر سمندر کے کنارے بسا ایک خوبصورت اور پُرفضا شہر ہے جو بالیشور ضلع کا صدر مقام ہے اور اڑیسہ کی راجدھانی بھونیشور سے ۱۹۴ کیلومیٹر شمال مشرق میں واقع ہے۔ مغربی بنگال کا 'مِدناپور' ضلع مشرقی سمت سے اس سے لگتا ہے۔ اکتوبر ۱۸۲۸ میں اس ضلع کی تاسیس ہوئی تھی۔ ۳۶۳۴ مربع کیلومیٹر میں پھیلے اس ضلع کی کل آبادی تقریباً ۲۴ لاکھ ہے اور تعلیمی لحاظ سے اڈیشا کے نمایاں اضلاع میں شمار ہوتا ہے۔ عموماً بالاسور کے خبروں میں رہنے کی وجہ 'چاندی پور رینج' ہے جسے 'میزائل سٹی' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جب بھی ڈی آر ڈی او کسی میزائل وغیرہ کی آزمائش کرتا ہے تو یہ شہر قومی و بین الاقوامی میڈیا کی سرخیوں کا حصہ بن جاتا ہے۔ ایسے خوبصورت اور اہم شہر کی زیارت کی تمنا لیے ہم نکل پڑے ۲۶ رجنوری ۲۰۲۲ کی شام کو۔ حالانکہ ابتدائے عمر سے ہی مجھے سیر و تفریح سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں بڑے بھائی کی مدد سے ایک مرتبہ لال قلعہ ہو آیا تھا۔ پھر جے این یو میں داخلہ ملا تو ڈی ٹی سی کی بسوں کے ذریعے کئی معروف جگہوں کے ساتھ ساتھ قطب مینار وغیرہ کی بھی سیر کی، کبھی نزدیک سے تو کبھی دور ہی دور سے۔ محبت کی لازوال نشانی تاج محل کو پہلی بار اس وقت دیکھا جب ایک ریفریشر کورس کے لئے لکھنؤ سے علی گڑھ حاضر ہوا، تو پھر یہیں سے اکیڈمک اسٹاف کالج کی انتظامیہ نے مجھ سمیت تمام شرکاء کو آگرہ پہنچانے کا بندوبست کیا جہاں ہمیں جذبی پر منعقد ہونے والے ایک قومی سیمینار میں شرکت کرنی تھی۔ علی گڑھ سے جب آگرہ پہنچ ہی گیا تو معروف ادیبہ سعدیہ سلیم صاحبہ کے شوہر جناب سلیم شمسی جو پیشے سے وکیل ہیں کی مہربانی سے تاج محل کا دیدار نصیب ہوا۔ کچھ اپنی علمی و تعلیمی مصروفیات اور سیر و تفریح کے تقاضوں سے میل نہ کھانے والے مزاج نے مجھے دنیا کی عظیم خوبصورتیوں سے لطف اندوز ہونے سے روکے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ میں رہ کر بھی ہم نے ابھی تک لکھنؤ کو بہت قریب سے نہیں دیکھا ہے۔ میرے رشتے دار اور دوست و احباب اکثر یہ طعنہ دینے میں کوئی کور و کسر باقی نہیں رکھتے کہ تم تو لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی 'لکھنؤ والا' نہیں بن سکے۔ نیوز میں کسی جگہ کا نام سن کر جب وہ پوچھتے ہیں کہ 'تم نے فلاں جگہ تو دیکھا ہوگا، اور وہاں فلاں فلاں چیزیں بھی دیکھی ہوں گی' تو ان کے اس استفسار پر نفی میں سر ہلاتے ہوئے اکثر دل ہی دل میں مسکرا دیتا ہوں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کلّی طور سے مجھے سیر و تفریح کی جگہوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو، یا پھر میری دلچسپیات کے مراکز و منابع کچھ اور ہوں۔ بس نہیں گئے تو نہیں گئے اور اگر کبھی اتفاق سے کہیں نکل گئے تو پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

جب بالاسور میں منعقد ہونے والے قومی سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو پتہ نہیں کیوں، اس سفر کے لیے اندر سے ایک خوشی و مسرت کا احساس ہوا۔ حالانکہ اڈیشا کا میرا یہ کوئی پہلا سفر نہیں تھا، اس سے پہلے اکادمی ہی کی دعوت پر اڈیشا کے مختلف شہروں بھونیشور، کٹک اور بھدرک وغیرہ حاضر ہو آیا ہوں۔ ان سفروں سے لوٹ کر آنے کے بعد میرے شاگردوں کی خواہش ہوتی تھی کہ میں اپنے سفر کی تفصیلی روداد رقم کروں لیکن ایسا بوجوہ نہیں کر سکا۔ اس دعوت نامے کا سن کر میرے عزیز شاگرد شاہد حبیب کا اصرار بڑھ گیا کہ 'سر! اس بار آپ ضرور اپنے سفر کی روداد قلمبند کریں گے'۔ ان کے اس محبت آمیز اصرار سے مجبور ہو کر نہ صرف حامی بھر دی بلکہ ضروری نکات نوٹ کرنے کے لیے ایک نوٹ بک بھی ساتھ رکھ لی۔ اس بار کا سفر معروف شاعر و دانشور 'کرامت علی کرامت' کے فن اور شخصیت کے حوالے سے منعقد سیمینار میں شرکت کے باعث ہوا تھا۔ سیمینار کا دعوت نامہ اڈیشا اردو اکادمی کے سکریٹری جناب ڈاکٹر سید مشیر عالم کی طرف سے ملا تھا۔ ڈاکٹر سید مشیر عالم جے این یو کے میرے دوستوں میں سے ہیں۔ وہ ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں اور مزاجاً انتہائی مہذب اور شریف واقع ہوئے ہیں۔ محنت اور اپنے کام میں تسلسل ان کی پہچان ہے۔ انتظامی ذمہ داریوں کے باوجود خود بھی پڑھنے لکھنے میں لگے رہتے ہیں اور پڑھنے لکھنے والے لوگوں کی اپنی حد تک سرپرستی کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ جے این یو کے زمانۂ قیام میں ہم لوگوں کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا ہمہ وقت لگا رہتا تھا۔ لیکن وہاں سے نکلنے کے بعد یہ تعلقات کسی قدر تعطل کا شکار ہو گئے۔ چار پانچ سال قبل جب وہ پہلی بار اڈیشا اردو اکاڈمی کے سیکرٹری بنائے گئے تو

یہ خبر فیس بک کے توسط سے میری نظروں سے گذری۔ میں نے منقطع تعلقات کو بحال کرنے کا موقع مناسب جانا اور علیک سلیک کی ابتدا کی کوشش کی جس میں کامیابی ملی۔ سیمینار وغیرہ کے توسط سے یہ تعلقات اور بھی مستحکم ہوتے چلے گئے۔ سید مشیر عالم کی نگرانی میں اڈیشا اردو اکادمی تواتر کے ساتھ نت نئے موضوعات پر سیمینار، ورکشاپس، مشاعرے، قوالیاں اور دیگر بہت سے ثقافتی پروگرام کا انعقاد کرتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اکادمی مستقل طور سے مختلف موضوعات پر کتابیں بھی شائع کرتی ہے اور ایک سہ ماہی رسالہ 'فروغ ادب' کے نام سے پابندی سے نکال رہی ہے۔ اردو کے طلبہ کو مختلف نوعیت کے وظائف بھی دیتی ہے۔ میری معلومات کی حد تک اڈیشا اردو اکادمی اب تک کی اپنی تاریخ میں اتنی زیادہ متحرک وفعال کبھی نہیں رہی۔

پروفیسر کرامت علی کرامت جیسی ذی علم شخصیت کے فن کی قدردانی کے حوالے سے منعقد ہونے والے سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو فوراً ہی ریزرویشن کرالیا اور کچھ دنوں کی کوہ کنی کے بعد پیپر بھی لکھ ڈالا، مگر جب رخت سفر باندھنے کی ساعت آئی تو وہی تذبذب و گومگو کی کیفیت۔۔ جنوری کے ٹھنڈ کی شدت کو دیکھ کر بار بار میر انیسؔ کے مرثیے کا یہ مصرعہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ذہن کے پردے پر کوندنے لگتا۔

اس سردی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیر

بہر حال ہم نے 'بھونیشور راجدھانی' کا ٹکٹ لے کر پابہ رکاب ہونے میں ہی بہتری سمجھی جسے مجھے کانپور سے پکڑنا تھا۔ لکھنؤ سے کانپور کی مسافت ۷۰ کیلومیٹر ہے جسے لوکل ٹرینیں کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے میں طے کرتی ہیں۔ لیکن سفر شروع کرنے کا ارادہ بنا لینے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کانپور تک بس سے جاؤں یا ٹرین سے۔ اسی تذبذب اور گومگو کی کیفیت میں گھر سے نکل پڑا، چونکہ لکھنؤ کا بین ریاستی بس اڈہ اور چار باغ ریلوے اسٹیشن دونوں قریب قریب ہی واقع ہے۔ تو جب ذرا قریب پہنچا اور دو راستوں میں سے ایک کے انتخاب کا حتمی فیصلہ کرنے کا وقت آ گیا تو پھر اس تعین میں دیر نہیں لگی کہ ٹرین سے ہی کانپور پہنچنا بہتر رہے گا۔ جب چار باغ ریلوے اسٹیشن پہنچا تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کچھ ہی دیر میں 'چترکوٹ ایکسپریس' پلیٹ فارم نمبر ۴ پر لگ رہی ہے جو کانپور ہوتے ہوئے جبل پور جائے گی۔ فوراً ہی Unreserved کلاس کا ایک ٹکٹ لے کر سامنے لگے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ چونکہ یہ ٹرین لکھنؤ سے ہی کھلتی ہے اس لئے ٹرین میں کوئی خاص بھیڑ نہیں تھی۔ بہر حال 'راجدھانی ایکسپریس' کے متعینہ وقت سے کچھ پہلے کانپور پہنچ گیا۔ کنٹرول روم سے 'بھونیشور راجدھانی' کی آمد کے تعلق سے ابھی تک کوئی اناؤنسمنٹ نہیں ہوا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کوئی اناؤنسمنٹ ہو تبھی کسی دوسرے پلیٹ فارم کا رخ کروں، گرچہ موبائل پر این ٹی ای ایس ایپ کے ذریعہ اس کی پل پل کی حرکات سے واقف ہو رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر لگے ایک اسٹال سے چائے پی، بیگم نے رات کے کھانے کے لیے ایک توشہ دان بھی باندھ دیا تھا تو کئی مرتبہ سوچا کہ کھانے وغیرہ سے انتظار گاہ میں ہی فارغ ہو جاؤں۔ مگر ذہن کو جب بھی ٹٹولا، کھانے کی خواہش کو مفقود ہی پایا۔ کچھ ہی دیر میں پلیٹ فارم نمبر ۶ پر ہماری ٹرین کی آمد کا اعلان ہوا۔ تیزی سے متذکرہ پلیٹ فارم پر پہنچا تو ٹرین اب پلیٹ فارم پر آتی دکھنی شروع بھی ہو گئی تھی۔ مسافروں کی طرف سے تھوڑی سی مزاحمت کے بیچ اپنی نشست تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور فوراً گاڑی کھل بھی گئی۔ تھرڈ اے سی کا ایک بے رنگ سا ڈبہ اور ایک لمبے سفر کی تکان کا احساس۔ بے رنگ اس لیے کہ اے سی کلاس میں پردے وغیرہ کا جو تام جھام 'کرونا' سے قبل ہوا کرتا تھا، وہ اب نہیں تھا۔ سامان کو برتھ کے نیچے رکھنے کے بعد میں نے جیسے ہی نظر ذرا اوپر اٹھائی تو دیکھا کہ سامنے سائڈ والی برتھ کے مسافر نے ریلوے کی طرف سے جو دو چادریں ملی ہیں، انھیں میں سے ایک کو دونوں سائڈ سے باندھ کر ایک جھونپڑی سی بنالی ہے۔۔۔۔۔ یہ دیکھ کر ذہن میں دبی ایک بہت پرانی بات یاد آ گئی۔ قریب تیس چالیس قبل جب دیہات میں شرفاء کی خواتین بیل گاڑی پر سوار ہو کر نکلتی تھیں تو گاڑی کے اوپر لکڑیوں اور چادروں کی مدد سے ایسی ہی جھونپڑی نما ایک ڈھانچہ تیار کر لیا جاتا تھا تاکہ کسی غیر مرد کی نظر سے بچا جا سکے۔ جدید سہولیات سے آراستہ ہونے کا دعویٰ کرنے والی راجدھانی ایکسپریس کی انتظامیہ کی تھوڑی سی سستی کی وجہ سے ضرورت پڑنے پر لوگ کیسے پرانے جگاڑ کو اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اس کی ایک مثال سامنے دیکھ کر حیرت کر رہا تھا اور ریلوے کو اپنی پالیسی میں تبدیلی لانے کی ضرورت کا احساس کرانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں 'جھونپڑی' کے اندر سے ایک بچے کے رونے کی آواز آئی اور برابر آتی ہی چلی گئی۔ اسی کے ساتھ ایک عورت کے ذریعے اس بچے کو لوری دینے اور پھر فوراً ہی ڈانٹ ڈپٹ

کرنے کی آوازیں بھی کمپارٹمنٹ کی خاموش فضا کو چیرتے ہوئے ذہن کو مکدر کرنے لگیں۔ اب پردہ پوری طرح ایک طرف سے کھسک کر دوسری طرف کو ہو چکا تھا۔ دیکھا تو اس 'جھونپڑی' میں بچہ اور عورت کے علاوہ ایک مرد بھی نظر آرہا تھا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ معمولی شکل وصورت کی خواتین کبھی کبھی پردے کا اتنا زیادہ اہتمام کر لیتی ہیں کہ عام حالات میں اگر کوئی جمالیاتی طور سے حساس شریف النفس آدمی کی نظر ان پر پڑ جائے تو پھر وہ زندگی بھر دوبارہ اُدھر دیکھنے کا حوصلہ نہیں کر پائے گا۔

کچھ ہی دیر میں بیرا پانی کا بوتل تھما گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آکر ڈنر کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے حامی بھری تو اس نے پوچھا کہ ویج (Veg) یا نان ویج (Non-Veg)؟ تھوڑے سے توقف کے بعد کہا: ویج۔ گرچہ ریزرویشن کراتے وقت نان ویج کا ہی کالم فِل کیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیا سوچ کر بیرے کو ویج لانے کا کہہ دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کبھی کبھی انسان کے تحت الشعور پر مذہب، کلچر اور روایت کی چھاپ اتنی گہری ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی لمحے اس سے آزاد نہیں ہو پاتا، میرے ساتھ بھی شاید ایسا ہی کچھ ہوا۔ ویج اور نان ویج کی گردان میرے ذہن کے پردے پر تیز تر ہوتی گئی لیکن ذہن یہ ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا کہ ایک اضافی چیز 'حلال' کے چکر میں ٹرین کی کینٹین کا عملہ کیوں کر درد سر مول لے گا؟

جب کہیں باہر سفر پر نکلتا ہوں تو عام حالات کے برعکس میرے تئیں میری بیگم کے دل میں محبت کا جذبہ کچھ زیادہ ہی شدید ہو جاتا ہے اور جیسا کہ اوپر عرض کیا، انھوں نے میری مرضی کے خلاف رات کے لئے ایک توشہ دان بھی ساتھ کر دیا تھا۔ عشائیہ کے لیے دسترخوان بچھایا تو خراب ہو جانے کے اندیشے سے اسے بھی نکال کر سامنے رکھ لیا۔ اب ایک طرف بیگم کے پیار کا مظہر تھا تو دوسری طرف ٹرین کے نئے ذائقے کو ٹیسٹ کرنے کی چاہت اور۔۔۔۔۔۔ خیر! بات جو بھی ہو مگر کھانے کی ڈِشز کی کثرت کے سامنے میری خواہش بڑی کہتر نظر آرہی تھی۔ 'فلائنگ کِس' کے انداز میں جلدی جلدی ان سبھی سے کچھ نہ کچھ نوچ کھسوٹ کھایا، نئے ذائقے کا لطف بھی لیا اور بیگم کے پیار کا احساس بھی کیا۔ بہر حال شکم سیر ہو کر فوراً ہی بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ چونکہ مجھے اونچے تکیے کی عادت ہے لہذا کمبل کو تہہ کر کے تکیے کے اوپر ڈال لیا اور ایک چادر کو بچھا کر دوسری کو اوڑھ لیا۔ اس طرح سے کچھ ہی دیر میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

غالباً رات کا ایک ڈیڑھ بج رہا ہوگا، بلڈ پریشر کی دوا کی وجہ سے میرے اوپر نیند کا بھاری غلبہ تھا کہ اچانک سامنے والی 'جھونپڑی' میں سے ایک بار پھر بچے کی دھاڑیں مار کر رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ دل ہی دل میں جز بز ہوا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔ اے سی کلاس کا ٹکٹ لیتے ہوئے آدمی کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ کوچ میں سکون رہے گا، پڑھنے لکھنے کا پورا موقع ملے گا یا پھر کسی خاص موضوع پر اطمینان سے 'غور وفکر' ہی کر سکے گا۔ مگر یہاں تو حالات بالکل برعکس تھے، کیونکہ وہ خاتون اب بھی گھوڑا بیچ کر سو رہی تھی اور بے فکری کی نیند کے مزے لوٹنے میں لگی ہوئی تھی۔ شاید وہ اس فکر کی حامل رہی ہوگی کہ بچے کو کبھی بھی رونے اور چیخنے چلانے کا پورا لائسنس حاصل ہے۔ چاہے دیگر لوگوں کا آرام اور اس کی نیندیں بھاڑ ہی میں کیوں نہ جائیں۔ عورت کی اس لاپرواہی پر غصہ تو بہت آرہا تھا، مگر۔۔۔۔۔ میں نے سختی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لمبی، گہری سانسیں لینے لگا۔ پھر نہ جانے کب نیند آگئی۔

صبح کے چھ سات بجے کا وقت رہا ہوگا، درمیان والی برتھ پر سوار مسافر اچانک نیچے آدھمکا۔ عمر کوئی چالیس کے آس پاس رہی ہوگی ۔۔۔۔۔ نیچے اتر کر کہنے لگا کہ 'اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم اپنی برتھ فولڈ کر کے نیچے بیٹھ جائیں، مجھ سے اب لیٹا نہیں جا رہا ہے'۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے اس سے کہا: بھئی! ابھی رات کافی ہے، تم ابھی اوپر ہی جا کر بیٹھو، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے ابھی کچھ دیر اور سونا چاہتا ہوں۔ اس نے کوئی ضد نہیں کی، وہ بھلے مانس کی طرح فوراً ہی اوپر اپنی برتھ پر چلا گیا۔ بعد میں جب اپنی نیند مکمل کر چکا تو خود ہی اس کو آواز دی اور کہا کہ 'اب تم اپنی برتھ فولڈ کر سکتے ہو۔۔۔۔۔' وہ فوراً اپنی برتھ فولڈ کر کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک اس سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ دوران گفتگو پتہ چلا کہ اس کا نام گوروِیندر سنگھ ہے، پنجاب کے سنگرور ضلع کا رہنے والا ہے اور بالاسور میں جاب کرتا ہے۔ یہ سب بتاتے ہوئے کہیں نہ کہیں وہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ پنجاب جیسے خوشحال اور زرخیز علاقے کو چھوڑ کر وہ کہیں اور جاب کے لیے جا رہا ہے۔ اس درمیان اور بھی کئی مسافر درمیانی اور اوپر والی برتھوں پر آتے گئے جن میں اکثریت خواتین کی تھی، یہ کچھ اسٹیشنوں کا سفر کر کے اتر جاتیں لیکن بالاسور تک یہ لڑکا ساتھ رہا۔ بالاسور پہنچا تو اسی نے ٹرین سے اترنے میں میری مدد کی، اس کی رفاقت کی وجہ

سے بیگ وغیرہ اتارنے میں کافی مدد ملی۔ازراہ تشکر میں نے چند جملے کہے تو چلتے وقت وہ موبائل نمبر کا تبادلہ کرتے ہوئے رخصت ہوا۔

بالاسور میں 'اڈیشا اردو اکادمی' کے ذمہ داران نے جس ہوٹل میں میرے ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا، وہ تین ستارہ ہوٹل تھا، نام تھا 'پنچ جنیہ'۔ چونکہ یہ ہوٹل اسٹیشن سے بالکل قریب ہی واقع تھا، اس لیے میں نے اکادمی کے عملے کو اسٹیشن پر آنے سے منع کر دیا تھا۔خود ہی آٹو لے کر ہوٹل پہنچ گیا۔ہوٹل پہنچنے کے دورانیہ میں اچٹتی سی نگاہ آس پاس کے مناظر پر ڈالتا رہا۔یہاں کے حسن سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پہلا تاثر ذہن میں یہ آیا کہ شمالی ہند کے شوخ وچنچل حسن کے برخلاف یہاں کی نازنینوں میں معصومیت و ملاحت کے عناصر زیادہ واضح ہیں۔اسی کیفیت میں گم ہوٹل کے گیٹ پر پہنچا تو یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ یہاں پر کہیں بھی ہوٹل کے نام کی تختی یا کوئی سائن بورڈ وغیرہ کچھ بھی نہیں لگا ہے جس سے شناخت ہو سکے۔اسی کے ساتھ جگہ بھی بڑی سنسان لگ رہی تھی، حالانکہ مین روڈ پاس میں ہی تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو آٹو والا غائب۔اب یہ فکر ستانے لگی کہ اگر یہ ہوٹل 'پنچ جنیہ' نہیں ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ 'آگے کنواں، پیچھے کھائی' والی مثل پورے طور پر صادق آرہی تھی۔ ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ سامنے اندر کی جانب ایک شخص نظر آیا، آگے بڑھ کر پوچھا کہ 'کیا یہ 'پنچ جنیہ' ہوٹل ہے؟ اس نے اثبات میں سر ہلایا، تب جا کر تسلی ہوئی۔ پھر وہ خود ہی میرے سامان کو لے کر ہوٹل کے کاؤنٹر پر پہنچا۔یہاں پر منیجر نے تفصیلات کی خانہ پری کے لیے ایک فارم میری طرف بڑھایا۔فارم قدرے طویل تھا اور میرا چشمہ سامان کے ساتھ بیگ کے اندر ہی پیک تھا، لہذا میں نے اندازاً قلم چلانا شروع کر دیا۔ بہ مشکل چند ایک خانے اس کی ہدایت کے مطابق پُر کیے ہوں گے کہ اس نے فارم پر دستخط کروا کر مجھ سے لے لیا۔اب ہوٹل کے اسی ملازم کی معیت میں اپنے کمرے کی طرف چلا۔روم تک پہنچا کر اس نے مجھ سے لنچ کے لیے پوچھا، میں نے نفی میں جواب دیا کیوں کہ کچھ ہی دیر قبل ٹرین میں لنچ کر چکا تھا۔البتہ شام کی چائے و ناشتے وغیرہ کے بارے میں تفصیلات معلوم کیں۔اس کے بعد پانی کی دو بوتلیں رکھ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔اس کے جانے کے بعد میں فریش ہو کر بستر پر آ گیا۔سوچا کہ پہلے کچھ دیر نیند لے لوں پھر 'مقالے' پر نظر ثانی کروں گا۔مگر گدے میں اس قدر زیادہ فوم پڑا تھا کہ جس سائڈ بھی کروٹ لیتا، گدے کے اندر دھنستا چلا جاتا اور اسی تناسب سے دوسری سائڈ اوپر کو اٹھ آتی۔ الغرض کسی بھی طرح سے نیند کا آنا محال لگ رہا تھا۔اپنی یہ حالت دیکھ کر علامہ اقبال کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔کہیں پڑھا یا سنا تھا کہ جب والیِ ریاست بھوپال کی دعوت پر اقبال بھوپال تشریف لے گئے اور نواب صاحب کے مہمان بنے تو ان کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ واقعہ پیش آیا تھا۔بستر کے حد درجہ نرم گداز ہونے کی وجہ سے وہ سو نہ سکے اور ساری رات کروٹیں بدلتے ہی گزار دیئے۔صبح کو جب خادم خیر خیریت کے لئے ان کے کمرے میں پہنچا تو ان کو باتھ روم کے فرش پر لیٹے ہوئے پایا۔اسی طرح کی عجیب کیفیت میرے ساتھ بھی پیش آرہی تھی۔ دریں اثنا اڈیشا اردو اکادمی کے سیکرٹری ڈاکٹر سید مشیر عالم کا فون آ گیا۔حال احوال کے بعد کہنے لگے کہ میں ساڑھے آٹھ بجے تک ہوٹل پہنچ رہا ہوں، ڈنر آپ تمام معزز مندوبین کے ساتھ ہی کروں گا۔فون رکھ کر پھر لیٹ گیا لیکن مشکل سے تھوڑی نیند آئی ہوگی کہ بیرا روم کھٹکھٹانے کے بعد خود ہی اندر داخل ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ چائے کے ساتھ شام کے ناشتے میں اور کیا چیز مل سکتی ہے؟اس نے سب سے پہلے مختلف انواع و اقسام کے پکوڑوں کے نام گنوانے شروع کر دیئے۔ میں نے اس کو درمیان میں ہی روکا اور پنیر پکوڑے کے بارے میں پوچھا۔۔۔۔۔اس نے کہا کہ جو بھی چیز آپ لینا چاہیں گے، مل جائے گی لیکن وہ فل پلیٹ ملے گی۔آپ ہاف پلیٹ یا کوارٹر پلیٹ منگوائیں گے تو بھی وہ فل پلیٹ ہی شمار ہوگی۔ میں نے بہت زیادہ سمع خراشی کو برداشت نہ کرتے ہوئے سیدھے سیدھے صرف چائے اور پنیر پکوڑے کا آرڈر دے دیا۔وہ فوراً ہی چائے اور پنیر پکوڑے لے کر نمودار ہو گیا۔ خیر چائے وائے سے فارغ ہونے کے بعد صبح کو پڑھے جانے والے اپنے مقالے کی قطع و برید میں لگ گیا۔

کام سے فارغ ہو کر ابھی میں اپنی گھڑی دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک سیکرٹری صاحب کے پی اے کا فون آیا کہ 'سیکرٹری صاحب ڈائننگ ہال پہنچ چکے ہیں، آپ بھی پہنچیں'۔ بیرے نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آپ لوگوں کے لئے فش کا اسپیشل آرڈر دیا گیا ہے۔ چنانچہ میں تیار ہو کر کچھ ہی دیر میں ڈائننگ ہال پہنچ گیا۔سیکرٹری صاحب نے خوش مزاجی سے ہمارا استقبال کیا، بشاشت ان کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ان کے علاوہ جو چند لوگ وہاں پر موجود تھے ان میں ڈاکٹر احمد

بدر صاحب (کریم سٹی کالج، جمشید پور)، ڈاکٹر نصرت جہاں صاحبہ (سریندر کالج فارووین، کولکتہ)، ڈاکٹر ایاز احمد صاحب (گورنمنٹ انٹر کالج، اٹوا، سدھارتھ نگر) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے سے سلام کلام کے بعد کھانا شروع کیا۔ پوری ٹیبل ہی انواع واقسام کی ڈشز سے بھری ہوئی تھی۔ مچھلی کے قتلوں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ مچھلی کی جسامت آٹھ دس کلو سے کم کی نہیں رہی ہوگی۔ سیکرٹری صاحب کے بار بار اصرار پر ہم لوگوں نے لذت کام ودہن کی ساری حسرتیں پوری کر ڈالیں اور شکم سیر ہو کر اللہ پاک کا نام لیا۔ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے اشاروں اشاروں ہی میں سیکرٹری صاحب نے بتا دیا کہ صبح کا ناشتہ ہوٹل والوں کی طرف سے ہے جو 'فری' ہے۔ لہٰذا صبح کو جو کچھ بھی سامنے آئے، اس سے پورے طور سے متمتع ہوں۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے ہوٹل کے کیمپس میں تھوڑی سی چہل قدمی کی، پھر اپنے اپنے کمرے میں آ گئے اور میں ایک بار پھر اپنے مقالے کی نوک پلک درست کرنے میں لگ گیا۔ اس سے فرصت ملی تو کچھ دیر موبائل پر ہاتھ صاف کیا اور سونے کے لئے بستر پر آ گیا۔ بستر کا حال میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اس کی نرم گدازی ہی میری نیند کے لیے آفت بن رہی تھی۔ لیکن سفر کی تکان چونکہ ابھی بھی غالب تھی، اس لیے کروٹ کی ادلا بدلی میں کب نیند آ گئی، خبر نہ ہوئی اور صبح اس وقت آنکھ کھلی جب بیرے نے ڈور بیل بجا کر جگایا۔ جلدی سے اٹھ کر غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ سیکرٹری صاحب نے ناشتے کے لیے فون کر دیا، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ ناشتے کی ٹیبل پر پہلے سے ہی موجود ہیں۔

ناشتے کے بعد فقیر موہن یونیورسٹی (الف ایم یو)، جہاں یہ سیمینار منعقد ہونا تھا، وہاں جانے کی تیاری میں جُٹ گیا۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی آ گئی۔ ہم لوگ سوار ہو کر الف ایم یونیورسٹی کے لئے نکل پڑے۔ ہوٹل سے سیمینار ہال کی مسافت مشکل سے آٹھ دس کلومیٹر رہی ہوگی۔ گاڑی میں بیٹھ کر گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہوا تو ہم نے یونیورسٹی کے بارے میں جاننا چاہا۔ ہمیں بتایا گیا کہ فقیر موہن یونیورسٹی اڑیہ زبان کے مشہور شاعر و ادیب، مفکر اور سماجی مصلح فقیر موہن سیناپتی (1847-1918) کے نام سے موسوم ہے۔ فقیر موہن کا شمار اپنے وقت کے گنے چنے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ اڑیہ زبان اور نسل کو مستحکم شناخت دلانے میں اور ان کے اندر قوم پرستی کا بیج بونے میں فقیر موہن کا بنیادی کردار رہا ہے، اس لیے انھیں جدید اڑیہ ادب کا بانی بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی فکر کی اشاعت و ترسیل کے لیے اڑیہ زبان میں کئی رسالے نکالے اور ناول، افسانے اور شعری مجموعے یادگار چھوڑے۔ ان کی طویل نظم 'اُتکلا برہمانم' کو اڑیہ زبان وادب میں کلاسک کا درجہ حاصل ہے ۔۔۔۔ یہ معلوماتی گفتگو جاری تھی کہ ہم لوگ سیمینار ہال پہنچ گئے۔ وہاں پر ہمارا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ پورا ہال طلبہ و طالبات، اساتذہ اور باذوق سامعین سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ طلبہ کے مقابلے میں طالبات کی تعداد زیادہ تھی۔ سب سے پہلے اسٹیج پر سبھی بیرونی و مقامی مندوبین کی گلپوشی کی رسم پوری کی گئی۔ اس کے بعد پوسٹ گریجویٹ کونسل کے چیئرمین پروفیسر منیش چند ادھیکاری کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ ادھیکاری صاحب یونیورسٹی کے فزیکس ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر ہیں۔ ان کی تقریر انگریزی زبان میں تھی لیکن انھوں نے اپنی باتوں کو سمجھانے کے لیے بیچ بیچ میں اڑیہ زبان کا بھی سہارا لیا۔ آپ نے احمد وصی کے اس شعر پر اپنی بات ختم کی:

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے
ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے

اس نوع کی گفتگو سے ان کی اردو زبان و ادب سے شغف ظاہر ہو رہی تھی اور ہم بطور خاص محظوظ بھی ہو رہے تھے اور اردو کی مرکزی بستیوں سے دور بہت دور اردو کی مقبولیت و محبوبیت کا مشاہدہ کر کے حیرت زدہ بھی تھے۔ ادھیکاری کے بعد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سنتوش کمار ترپاٹھی کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ وائس چانسلر صاحب کی گفتگو بھی انگریزی میں ہی تھی۔ وہ خود بھی اڑیہ زبان کے شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے نہ صرف اردو زبان و ادب کی جم کر تعریف و تحسین کی بلکہ انھوں نے اپنی یونیورسٹی کے اساتذہ سے اردو زبان سیکھنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ دوران گفتگو وہ یہاں تک کہہ گئے کہ اس یونیورسٹی کے جس شعبے میں پہنچ کر انھیں سب سے زیادہ تسکین قلب حاصل ہوتی ہے، وہ یہاں کا شعبۂ اردو ہے۔ شعبے کے اساتذہ کی طرف سے ان کو مل رہی عزت و اکرام کا انھوں نے بطور خاص ذکر کیا۔ فیضؔ کے اس شعر پر انھوں نے اپنی گفتگو ختم کی:

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

اس کے بعد اڈیشا اردو اکادمی کے سیکرٹری ڈاکٹر سید مشیر عالم کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ آپ نے تمام ہی سیمینار کے شرکاء و سامعین کو خوش آمدید کہا، ان کا دل کھول کر استقبال کیا اور

ساتھ ہی سیمینار کے اغراض ومقاصد پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی۔انھوں نے اڈیشا اردو اکادمی کی سرگرمیوں کا بھی اجمالاً تعارف کرایا۔

افتتاحی سیشن کی آخری کڑی کے طور پر ڈاکٹر احمد بدر صاحب کو کلیدی خطبے کے لیے دعوت دی گئی۔ اپنے خطبے میں انھوں نے پروفیسر کرامت علی کرامت کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالی اور خاص طور سے اڑیہ زبان و ادب سے ان کی دلچسپی ولگاؤ کا ذکر کیا جو خود اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لئے بھی ایک نادر ونایاب چیز تھی، جسے سامعین نے خوب سراہا۔اس سیشن کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاداب عالم (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ایف ایم یونیورسٹی) نے انجام دیے۔ ڈاکٹر شاداب عالم، جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی ہیں۔ کچھ دنوں تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی تدریس کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔معلوم ہو رہا تھا کہ آپ نے اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور ہندی زبان وادب کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔کیونکہ آپ نے اپنی باتوں کو باوزن و بامعنی منانے کے لیے موقع بہ موقع اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور ہندی زبان وادب کے شعری ونثری حوالوں کا بخوبی سہارا لیا۔

چائے کے مختصر وقفے کے بعد سیمینار کے دوسرے سیشن کا آغاز ہوا۔اس سیشن میں خاص طور سے باہر سے آئے مندوبین نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے جس میں یہ نابکار بھی شامل تھا۔میرے مقالے کا موضوع تھا 'تنقید کا سنگ میل : کرامت علی کرامت'۔ میں نے اپنے پیپر کے توسط سے بتایا کہ:

''پروفیسر کرامت علی کرامت ایک معتبر تنقید نگار ہونے کے ساتھ ایک اعلیٰ پائے کے شاعر بھی ہیں۔ جہاں اردو شعر وادب میں ان کے مجموعے 'شاخ صنوبر'، 'گل کدۂ صبح شام' اور 'شعاعوں کی صلیب' ان کی شہرت عام اور بقائے دوام کے ضامن ہیں، وہیں ان کی شاعری کے انگریزی ترجمے 'God Particle and Other poems'؛ اور 'The Story of the way and other poems' بھی بڑے پیمانے پر دنیا میں اردو شعر وادب کے تعارف کا ذریعہ بنے ہیں۔

دراصل کرامت علی کرامت کی شاعری کے یہ مجموعے اس بات پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ وہ ایک اچھے ناقد تھے کیونکہ کسی شاعری میں موجود شاعر کے تخلیقی کرب کو سمجھے بغیر شاعری کے حسن وقبح کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ ایسی خوبی ہے جس سے ایک اچھے تنقید نگار کا واقف ہونا لازمی ہے۔کرامت علی کرامت کو یہاں پر یہ فضیلت بھی یہ حاصل ہے کہ ایک سرکردہ نقاد ہونے کے ساتھ ایک مخصوص ادبی تھیوری کے بھی بانی مبانی ہیں، جس کو انہوں نے 'اضافی تنقید' کے نام سے موسوم کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کو اردو تنقید کے ایک سنگ میل کے طور پر یاد رکھا جائے گا''۔

اس سیشن کے اختتام پر لنچ کے وقفے کا اعلان ہوا، جس کا اہتمام اکادمی کی طرف سے ہی کیا گیا تھا۔ اس میں طلبہ، اساتذہ اور مندوبین سبھی نے شرکت کی۔ باہر سے آئے مہمانوں کی خدمت میں وہاں کے اساتذہ وطلبہ بچھے جا رہے تھے۔ایسا جذبہ کم ہی جگہوں پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے میں شعبۂ اردو کی طرف چلا گیا جو پاس ہی میں تھا۔شعبے کی پوری عمارت صفائی ستھرائی کا ایک الگ ہی نظارہ پیش کر رہی تھی اور پوری بلڈنگ آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔ اساتذہ کے چیمبرس بہت ہی زیادہ کشادہ، کمپیوٹر، پرنٹر ودیگر تمام ہی جدید سہولیات سے آراستہ تھے۔شعبۂ اردو میں ہی میری ملاقات شعبے کے ایک استاد ڈاکٹر محمد شارب سے ہوئی، آپ حیدر آباد سنٹرل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی ہیں اور ایک ذی علم ومنکسر المزاج شخصیت کے مالک ہیں۔

کچھ ہی دیر میں خبر پہنچی کہ بہت جلد سیمینار کا تیسرا سیشن شروع ہونے جا رہا ہے۔ہم نے فوراً ہی سیمینار ہال کا رخ کیا۔یہ سیشن خاص طور سے مقامی کالجز اور یونیورسٹیز کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے وقف تھا، جو دیر شام تک چلتا رہا۔سیمینار کے خاتمے پر ایک بار پھر ہم ہوٹل میں تھے۔سیمینار کے دوران میں ہی ہم لوگوں کو ڈاکٹر شمشاد عالم نے اپنے گھر پر عصرانے کی دعوت دے دی تھی، جس میں پہنچنا ضروری تھا۔مختصر سے آرام کے بعد ہم سبھی لوگ ان کے دولت کدے کی طرف نکل پڑے۔موصوف نے لذت کام و دہن کا پرتکلف انتظام کر رکھا تھا۔دسترخوان پر مقامی و بین الاقوامی نوعیت کی مٹھائیوں ونمکین اور بسکٹ ومشروبات کے وافر حصے کو سجا دیا تھا۔گفتگو ہوتے ہوتے شام ہو چکی تھی، اس لیے ہم اس یادگار عصرانے کے میزبان سے اجازت لے کر ہوٹل لوٹ آئے۔ایک بار پھر رات کا کھانا اور صبح کا ناشتہ ہم لوگوں نے سیکرٹری صاحب کے ساتھ کیا اور ایک دوسرے کو الوداع کہتے ہوئے اپنے اپنے مستقر کی طرف روانہ ہو گئے اس امید کے ساتھ کہ ایک نئی جگہ پر ایک نئے سیمینار میں پھر ملاقات ہوگی اور ہم ادب کے فروغ کے لیے اپنے حصے کی شمع یوں ہی جلائے رکھیں گے جیسا کہ پروفیسر کرامت علی کرامت نے اپنی زندگی کے روشن و تابناک مراحل کے ذریعے ہمارے سامنے ایک قابل تقلید مثال پیش کی ہے۔

☆☆☆

قربانی

نورشاہ

سرینگر، کشمیر، (موبائل:8899637012)

اپنے والد اکرام الدین کی وفات کے وقت فوزیہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اکرام الدین سرکاری عہدہ دار تھے، اس لئے ان کی بے وقت موت کی وجہ سے ان کی بیوی کو فیملی پنشن حاصل کرنے میں زیادہ دقت نہیں آئی۔ ان کا مکان دو منزلوں پر مشتمل تھا۔

ایک منزل ماں بیٹی کے اپنے استعمال کے لیے کافی تھی، اس لیے دوسری منزل کرایہ پر دے دی۔ اگرچہ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ملنے والی رقم سے ان کا گزارہ مشکل سے ہو رہا تھا پھر بھی ماں اپنی بیٹی کی پڑھائی لکھائی کے لیے روپیہ پیسہ بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی لیکن بڑی اور اہم بات یہ تھی کہ فوزیہ کو اپنی ماں اور ماں کو اپنی بیٹی پر اعتماد تھا، بھروسہ تھا۔ فوزیہ ہمیشہ اپنی ماں سے نرم لہجے میں بات کرتی تھی اور ماں کے لہجے میں بھی ہمیشہ محبت اور شفقت ٹپکتی تھی۔ ان کی زندگی کے مختلف حالات و واقعات کبھی دھیمے دھیمے اور کبھی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے گئے اور اس دوران فوزیہ ایم۔اے اور ایم۔ایڈ کرنے کے بعد ٹیچر کے عہدہ پر بھی تعینات ہو چکی تھی اور ماں کی عمر کی رفتار بھی دہلیز پر آ چکی تھی۔ اب اسکول سے آنے کے بعد گھریلو کام میں مصروف ہونا اس کی عادت بن چکی تھی۔ البتہ ماں بیٹی کے ہاتھوں میں مہندی دیکھنے کے بعد اس جہاں سے رخصت ہونا چاہتی تھی لیکن بیٹی شادی کی بات سن کر اپنی گردن نہ میں ہلا دیتی۔ اس کے من میں کیا تھا ماں اس بھید سے بے خبر تھی، ناواقف تھی لیکن وہ اپنی بیٹی کے رکھ رکھاؤ سے پوری طرح مطمئن تھی۔

ماں کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ابھی چالیس ہی دن ہوئے تھے کہ رشتے آنے لگے۔ فوزیہ ہر بار انکار میں سر ہلا دیتی۔۔۔!

اور ایک دن سارے رشتہ دار، پڑوسی، جان پہچان والے حیران رہ گئے جب فوزیہ نے خود ہی تصدیق کی کہ وہ شہر کے امیر ترین شخص سے شادی کرنے کے لئے ہاں کر چکی ہے اور یہ عبداللہ صاحب تھے۔ یہ ان کی تیسری شادی تھی، پہلی بیوی کو طلاق دیا تھا، دوسری بیوی مر چکی تھی۔ ان کی کوئی اولاد بھی نہ تھی اور اب وہ بزرگوں کی صف میں شامل ہونے کے بعد بھی تیسری شادی کرنے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔

سب کی کہی کو ان کہی میں تبدیل کرنے کے بعد فوزیہ اور عبداللہ صاحب شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ بوڑھا گھوڑا لال لگام کی کہانی زندگی کی کتاب میں شامل ہو چکی تھی۔

یہ کہتے سنتے دو سال خاموشی سے بیت گئے۔

وہ بے حد اداس شام تھی جب عبداللہ صاحب ایک کار حادثے میں جان بحق ہوئے۔۔۔ عبداللہ صاحب مرحوم اپنی ساری جائیداد۔۔۔ سونا چاندی، بینک بیلنس، کوٹھی، کار اور بڑا سا پشمینہ سازی کا بزنس۔۔۔ اپنی ہر شئے، ہر ایک چیز فوزیہ کے نام کر چکے تھے۔

باتوں کو ہوا مل گئی تھی اور ہوا نے افواہوں کی آگ اور بھی بھڑکا دی۔ اپنے پرائے، ہمسایہ اور رشتہ دار اب مطمئن ہو چکے تھے کہ عبداللہ صاحب سے شادی کا مقصد صرف اور صرف اس کی جائیداد حاصل کرنا تھی۔

اور پھر حیرانگی کا نیا عالم سامنے آ گیا۔۔۔۔۔

فوزیہ نے مرحوم عبداللہ صاحب کے عالیشان مکان کو یتیم خانہ میں بدل دیا۔۔۔ عبداللہ یتیم گھر۔۔۔۔۔ یتیم بچوں کی پڑھائی لکھائی، کھانا پینا، رہن سہن اور ہنستی مسکراتی زندگی گزارنے کے بہت سارے راستے ہموار ہو گئے۔

عبداللہ صاحب سے شادی کرنے کا اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

اب وہ اکیلی تنہا اپنے آبائی گھر میں رہ رہی تھی۔۔۔۔!!

☆☆☆

شہرِ تمنّا کی آرزو

نصیر رمضان

مالیر کوٹلہ (پنجاب)، (موبائل:9988236310)

مین گیٹ کھول کر جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوا، اچانک میری نگاہ دروازے کے پاس پڑے ایک نیلے رنگ کے لفافے پر گئی جسے ڈاکیہ میری غیر موجودگی میں ڈال گیا تھا۔ یہ ایک خط تھا جس پر میرا نام لکھا تھا۔ لفافے کے کنارے پر بنے ہوئے نشان سے پتا چل رہا تھا کہ یہ پڑوسی مُلک سے آیا ہے۔ میں نے خط اُٹھالیا اور اُسے لیکر حیران ہوتا ہوا کمرے کے اندر چلا آیا کہ مجھے کون خط لکھ سکتا ہے۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے میں نے لفافہ پلٹ کر بھیجنے والے کا نام دیکھا' کے۔ اے۔ کمالؔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''اوہ۔۔۔۔۔''

جس شخص کی مجھے پچیس برسوں سے تلاش تھی، جس کے بارے میں کہاں کہاں سے میں نے پتا نہیں کیا۔۔۔۔۔ اور آج پچیس برسوں بعد اُس کا خط میرے سامنے تھا۔ اُس کا خط واضح ثبوت تھا کہ وہ حیات ہے جس کے بارے میں مجھ سمیت سبھی جاننے والوں کا خیال تھا کہ وہ کب کا مر کھپ گیا ہوگا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ میرا عزیز از جاں دوست کمال احمد زندہ ہے۔ میں نے جلدی سے لفافہ چاک کیا اور دیکھا کہ ایک خوبصورت ڈیزائین والا کاغذ تھا جس پر جاپانی پیچانی رائیٹنگ میں لکھا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

'میرے دوست سلیم۔۔۔۔!

میں جانتا ہوں میرا خط دیکھ کر تم حیران ہو رہے ہوگے اور مجھے دل ہی دل میں ہزاروں صلواتوں سے نواز رہے ہوگے کہ میں پچیس سال پہلے بنا کسی کو بتائے اِس ملک میں چلا آیا۔ اپنی آباؤ اجداد کی سرزمین کو چھوڑنا آسان نہیں لیکن تم جانتے ہی ہو کہ میں نے کن حالات میں شہر چھوڑا۔۔۔ تھا۔ مگر ایک راز کی بات بتا رہا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہاں بھی قحط الرجال ہے'

تمہارا اپنا

کمال احمد کمالؔ

اور اس سے آگے کچھ نہیں لکھا تھا۔ میں جانتا تھا وہ شروع سے ہی ایسا تھا زیادہ کچھ نہ کہنے والا۔ میں نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا اور اُس کے بارے میں سوچنے لگا اُس کا سراپا میری آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور وقت مجھے پیچھے کی طرف دھکیل کر ماضی میں لے گیا جہاں کمال احمد ملک کے گھر کے باہر کھڑا میں اُسے آوازیں دے رہا تھا۔

''کمال۔۔۔۔۔ اوہ یار کمال۔۔۔۔۔۔ جلدی کرو کالج نہیں جانا ہے کیا'' دروازہ کھلا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ مگر یہ کیا وہ ابھی تک تولیے بنیان میں ہی تھا۔ ایک ٹوٹی سی بڑی ٹیبل پر اُس کی اکلوتی شیروانی پڑی تھی۔ سفید پائجامہ ایک طرف پریس کیا رکھا تھا۔۔۔ پاس ہی ایک لکڑی کی ایک بینچ پر دو پیالیاں پڑی تھیں جس کے کنارے ٹوٹے ہوئے تھے، کچھ چائے چھلک کر باہر گری ہوئی تھی۔ بینچ کے چاروں پائے ڈھیلے تھے۔ کوئی بھی چیز رکھنے پر پورا بینچ ہل کر رہ جاتا تھا۔ ایک طرف پرانا سا پلنگ پڑا تھا جس کا اپنا رنگ نہ جانے کب سے اُڑ چکا تھا۔

''یہ کیا تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔۔۔۔ کالج کو دیر ہو رہی خُدا کے واسطے کوئی تو کام جلدی کیا کرو'' میں نے کہا۔

''ارے بھئی۔۔۔۔۔ وہ شیروانی پائجامہ رات کو ہی دھویا تھا۔ ابھی تک گیلا ہے پریس کر کے ہی سُکھا رہا ہوں۔۔۔۔۔ بس دس منٹ انتظار کرو چلتے ہیں'' کمال احمد نے شیروانی پر پریس کرتے ہوئے کہا۔

''اور۔۔۔۔۔ ہاں بھئی چائے پیو گے؟ اُس نے پوچھا۔ ''نہیں۔۔۔۔ گھر سے پی کے آیا ہوں'' میں نے کہا۔

''اچھا تو۔۔۔۔۔وہ کیتلی میں چائے اُبل رہی ہے دیکھنا ذرا'' اُس نے کہا ۔۔۔۔میں نے آگے بڑھ کر دیکھا چولہے پر کیتلی رکھی تھی۔ چائے اُبل اُبل کر سیاہ ہو کر برتن سے باہر آنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔''دودھ کہاں ہے!''

وہ تو ہے نہیں۔۔۔۔تھوڑا بہت کپ میں تھا رات کو بلّی پی گئی'' کمال احمد نے کہا۔ پھر جلدی جلدی اُس نے شیروانی زیب تن کی اور بغیر دودھ کی چائے کو حلق میں اُنڈیلا اور ہم دونوں باہر نکلے۔کمال احمد نے گھر کو تالا لگایا اور اُس کی چابی دروازے پر بنے روشن دان میں رکھ دی۔میں نے سائیکل کے آگے اُسے بٹھایا اور ہم باتیں کرتے ہوئے کالج کو رانہ ہو گئے۔کالج پہنچتے ہی ہم الگ الگ سیکشن کی طرف چلے گئے۔

تیسرا پیرڈ خالی تھا۔اُس میں ہم وظیفے کا چیک لینے کالج کی بنک برانچ میں چلے گئے۔کاؤنٹر پر چیک کیش کروا کر جب ہم باہر نکلے تو ہماری جیبوں میں

دو دو سو روپے آ چکے۔کمال احمد وہیں پر کھڑا ہو کر حساب لگانے لگا کہ کن ضروری اشیاء میں خرچ کرنا ہے۔

''چلو۔۔۔۔کینٹین چلتے ہیں آج کی چائے میری طرف''میں نے اُسے دعوت دی۔

اُس نے فوراً منع کرتے ہوئے کہا'' ارے نہیں۔۔۔۔تمہیں بھی وظیفہ ملا ہے اور مجھے بھی۔۔۔۔اس کی کوئی ضرورت نہیں'' اور میں نے سر تھام لیا۔قناعت پسند تو وہ شروع سے ہی سے تھا مگر کبھی کبھی اُس کی یہ عادت بُری لگتی ۔کالج کے ہونے والے فنکشن میں اکثر اُس کی غزل یا نظم سننے کو مل جاتی۔کبھی کبھی یار دوست پیرڈ مس کر کے اُسے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتے اور غزل ،نظم کی فرمائش ہوتی۔جی ہاں کمال احمد ایک اچھا شاعر بھی تھا بلکہ شاعر ہی پیدا ہوا تھا۔اُس کی ہیئت بھی اسی طرح کی تھی بھُورے رنگ کی شیروانی۔سفید پائجامہ،جیب میں قلم اور ہاتھ میں کورس کی کتابیں۔دوست اُس کو اسکول بوائے کہہ کر چھیڑتے مگر اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔اُردو ایسے بولتا تھا کہ دبستان لکھنؤ کی یاد آ جاتی لوگ بات کرنے سے گھبراتے تھے اور لڑکیوں کا کیا۔۔۔۔۔وہ تو کمال احمد سے پہلے ہی دس فٹ کی دوری رکھا کرتی تھیں۔

ایک بار کالج کی ہاکی ٹیم نے دوسرے کالج کو ہرا کر میڈل جیت لیا۔اسی خوشی میں سبھی اسٹوڈنٹس کا خیال تھا کہ چھٹی ہونی چاہیے۔پرنسپل تیار نہیں تھا۔سبھی لڑکے لڑکیوں نے کمال احمد کو اُن سے بات کرنے کے لیے چنا اور کچھ لڑکے لڑکیوں کا غول اُسے میدان کے ایک کونے سے پکڑ لایا جہاں وہ کتابوں میں سر گھسائے بقراط بنا بیٹھا تھا۔جب اُسے ساری بات بتائی تو وہ تیار ہو گیا۔

''ٹھیک ہے میں پرنسپل صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہوں،اگر میں ناکام رہا تو مجھ پہ کوئی حرف نہ آئے''اُس نے کہا۔

سبھی نے ایک آواز میں کہا'' نہیں۔۔۔نہیں ہم تمہارے پیچھے رہیں گے''اور اُسے پرنسپل کے روم کے باہر لے گئے۔کمال احمد شیروانی کو درست کرتا کمرے کے اندر چلا گیا اور پھر اُس نے سلام دُعا کے بعد تقریر شروع کی تو باہر کھڑے سبھی اسٹوڈنٹس منہ دبا کر ہنسنے لگے۔

اندر سے اُس کی آواز آ رہی تھی''محترم پرنسپل صاحب۔۔۔۔پڑھائی تو روز ہوتی ہے اگر آج کالج کو جو عزّت ملی ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہو،اگر طلبا ذرا تفریح کر لیں۔۔۔ایسا میرا نہیں سب کا خیال ہے''کمال احمد نے کہا۔

''کون ہیں وہ سب؟''پرنسپل کی آواز گونجی۔

''جی۔۔۔۔۔وہ سب باہر کھڑے ہیں''

''بلاؤ۔۔۔۔۔سب کو''اتنا سنتے ہی سبھی کھسک گئے۔جب کمال احمد باہر آیا تو کوئی بھی اسٹوڈنٹ موجود نہیں تھا۔اس کے بعد اُس کی وہ دُرگت بنی کہ کئی دنوں تک سب سے خفا رہا مگر سب کو اُسے منانے کا طریقہ معلوم تھا۔ہم سب اُس کو فری پیرڈ میں پکڑ کر کینٹین لے گئے۔ایک کپ چائے اور دو غزلیں سنانے کے بعد اُس کی خفگی دُور ہو گئی۔کمال احمد کالج کی انجمن''بزمِ ادب'' کا رُوح رواں تھا۔کالج کی طرف سے منعقد ایک مشاعرے میں اُسے پہلا اِنعام ملا تھا جس کی وجہ سے تمام اساتذہ اُس کی عزّت کرتے تھے۔کالج کے سالانہ فنکشن میں اُس نے اپنی ایک پسندیدہ غزل سُنائی تھی جو میرے کانوں میں اب تک گونج رہی ہے۔۔۔۔۔

شہر میں میری زباں کوئی سمجھتا نہیں
میں صدا دیتا ہوں، پر کوئی ٹھہرتا نہیں
گھر سے تاریکیٔ شب کو میں نکالوں کیسے؟
میرے آنگن میں کہیں چاند اُترتا ہی نہیں

سامعین میں موجود لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور منہ دبا کر ہنسنے لگیں۔۔۔پرنسپل نے اسٹیج سے لڑکیوں کو گھورا مگر کمال اپنی ہی دُھن میں سناتا رہا۔۔

آنکھ سوُرج کی، مری راہ تکے گی کب تک؟
میں وہ جگنو، جو اُجالوں میں چمکتا ہی نہیں
برگِ تنہا ہوں، شجر پر جیے جانا ہے
عذاب شاخ سے ٹوٹ کے مٹّی میں بکھرتا ہی نہیں
کوئی بستی ہو کہ ویرانہ یا جنگل کمالؔ
جانے کیا ہو گیا جی کو، کہیں لگتا ہی نہیں

کالج کے فنکشنز اُس کے کلام کے

بغیر ادھورے رہتے تھے ۔میری اور میرے ایک اوردوست جان محمد کی کمال احمد سے پہلی ملاقات ایک عجیب سے ماحول میں ہوئی ۔جب ہمیں کالج سے چھٹی ہوتی تو ہم دونوں قبرستان میں چلے جاتے ۔ایسے ہی ایک ابر آلود دن کو ہم قبرستان میں گھوم رہے تھے کہ ایک ٹوٹی ہوئی قبر کے پاس تقریباً اُس میں گھُسا ہوا ایک شخص نظر آیا جو کچھ لکھ رہا تھا۔ہم لوگ ڈر گئے ۔لیکن پھر حوصلہ کر کے اُسے آواز دی ''کون ہو تم ؟''میں نے پوچھا جبکہ جان محمد اُس کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کون ۔۔۔۔۔ہوں میں ۔۔میں کون ہوں؟ اُس نے ایک شعر پڑھا؛

سانسوں کے دشت میں تنہا بھٹک رہا ہوں
ویران زندگی کے ہونٹوں کی بددُعا ہوں

ہمیں لگا کوئی مخبوط الحواس شخص ہے جو اس شہرِ خموشاں میں بھٹک کر آ گیا ہے۔''ہم سب کون ہیں؟۔۔۔دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں'' اُس نے کہا جان محمد نے کہا'' حضورِ اعلیٰ ۔۔۔ہمیں تو پتا ہے کہ ہم کون ہیں ۔۔؟۔مگر آپ کون ہیں؟ جو اِس ویرانے کو آباد کرنے چلے آئے''

'' ارے بھئی ۔۔۔میں ایک ادنیٰ سا آدمی ہوں جو جو دُنیا کے ہنگاموں سے دوُر کبھی کبھی یہاں چلا آتا ہوں ۔۔۔اِسم گرامی کمال احمد ہے۔ سرکاری کالج کا طالب علم ہوں ۔۔۔شاعری سے شغف ہے اور اس وقت بھی غزل کا نزول ہو رہا تھا مگر آپ حضرات کے دخل درمعقولات ہونے سے خیال منتشر ہو گئے'' اُس کی اتنی لمبی تفصیل سے ہمارے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

میں نے کہا'' جی ۔۔۔ہم لوگ جنّات اور شاعروں کو دیکھ کر بھاگنے والوں میں سے نہیں ہیں،ہمیں اپنا دوست ہی خیال کریں''۔

اُس نے پھر ایک شعر پڑھ دیا:

جو سرِ شام مجھے چھوڑ کے بھاگا ہوگا
وہ کوئی اور نہیں میرا ہی سایہ ہوگا

ہمیں لگا آدمی دلچسپ ہے اور پھر ہم نے اُسے اپنا دوست بنا لیا اور اس کے بدلے میں ایک غزل بھی سُننی پڑی جو وہ لکھ رہا تھا:

سینکڑوں سانچوں میں ڈھلتے ہیں ترے شہر کے لوگ
نِت نئے رنگ بدلتے ہیں ترے شہر کے لوگ
موم کا جسم لیے کیسے ترے پاس آوں!
آگ ہونٹوں سے اُگلتے ہیں ترے شہر کے لوگ
میں تو ٹُوٹا ہوا پتّا ہوں مری بات ہی کیا!
پھول پیروں سے مسلتے ہیں ترے شہر کے لوگ
سر تا پا جھلسے ہیں تنّور کی مٹّی جیسے
جانے کس آگ میں جلتے ہیں ترے شہر کے لوگ
نصف ننگے ہیں بدن ہڈیاں برہنہ کمالؔ
کیسے سج دھج کے نکلتے ہیں ترے شہر کے لوگ

اس ملاقات کے بعد بھی ہم لوگ اکثر قبرستان میں ملتے رہتے تھے۔کمال احمد ایک ہی جملہ کہتا:'آؤ کوئی ویرانہ آباد کریں'

لوگ اُس کی قدر نہیں کرتے تھے بلکہ اُسے مذاق کا موضوع بنا لیتے ۔اُس نے خود ہمیں بتایا تھا کہ ایک بار وہ نماز کے لیے جامع مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو پیچھے سے کسی نے اُسے آواز دی'کمال بھائی چائے پی لو' اور اُس نے جواب دیا تھا' پہلے نماز ادا کر لوں' جب وہ نماز پڑھ کر آیا تو کسی نے حامی نہیں بھری کہ چائے کا کس نے بولا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ آواز نیچے بنی دُکان سے ہی آئی تھی مگر۔۔۔۔۔اس لیے وہ لوگوں کے طنزیہ رویوں سے اکثر ناراض ہی رہتا تھا۔اِس میں اُس کی غربت اور مسکینیت کا زیادہ دخل تھا۔بی۔اے۔کے آخری سال میں جب امتحان سر پہ تھے ،کالج کی لائبریری کے پیچھے فٹبال گراؤنڈ میں ہم تینوں بیٹھے تھے میں نے کمال احمد اور جان محمد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا''امتحان میں مصروفیت رہے گی اس لیے یہ سوال ابھی پوچھ لیتا ہوں کہ امتحانوں کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' کمال احمد نے جواب دیا ''میرا ارادۂ مصمم مدرس کے فرائض انجام دینے کا ہے،بی۔اے کے بعد اُردو سے ایم۔اے کروں گا اور کسی اسکول میں بطور اُستاد خدمت انجام دُوں گا'' میں نے جان محمد کی طرف دیکھا اُس نے کہا:

''دیکھو بھئی! پڑھائی میں تم لوگوں کو تو علم ہے کہ میں کیسا ہوں اگر۔۔۔نکل گیا تو موقع دیکھیں گے۔ورنہ میرا ہارڈ ویئر کاروبار کرنے کا ارادہ ہے''

'' بھئی ۔۔۔میں تو ایم۔کام کرنے کا ارادہ رکھتا،اس کے بعد کوئی اچھی سی جاب کر لیں گے آخر ہم اتنا پڑھ کس لیے رہیں ہیں'' میں نے اپنے ارادوں سے باخبر کیا۔

''جو جہاں جانا چاہے جائے مگر ہم لوگ ہمیشہ ایسے ہی ملتے رہیں گے'' جان محمد نے ایک جذب کے عالم میں کہا۔ہم سب نے اُس کی تائید کی۔

''اس سے پہلے کہ گھنٹا بجے، چند اشعار ہو جائیں جو تازہ آج ہی نازل ہوئے ہیں'' کمال احمد نے کہا اور پھر اس سے پہلے کہ ہم کوئی جواب دیتے وہ شروع ہو گیا۔

رازِ دل یونہی ہر ایک شخص پہ افشا نہ کرو
ملو سب سے!مگر سب پہ بھروسہ نہ کرو
نا اُمیدی کے سوا کچھ نہ ملے گا تم کو
کاغذی پھولوں سے خوشبو کی تمنّا نہ کرو

اتنے میں گھنٹا بج گیا اور ہم سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی اپنی کلاسوں کی طرف چلے گئے۔امتحان آ گئے اور ہمارا ملنا بھی کم ہو گیا۔آخری پیپر دے کر جیسے ہی ہم کمرۂ امتحان سے باہر نکلے ۔میں نے چین کی سانس لی۔کچھ دیر بعد کمال احمد بھی آ گیا اور ہم نے کینٹین کا

رُخ کیا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے رستے ہو لیے۔ اس کے بعد بھی ہم لوگ ملتے رہے مگر ٹھکانہ وہی قبرستان رہا۔

ایک مہینے بعد رزلٹ آؤٹ ہوا تو میں اور کمال احمد فرسٹ ڈویژن میں اور جان محمد ایک پیپر میں کچھ نمبروں سے رہ گیا۔ میں نے ایم۔کام میں داخلہ لے لیا اور کمال احمد علی گڑھ چلا گیا۔ وہاں اُس نے ایم۔اے اُردو میں داخلہ لے لیا بقول اُس کے وہاں ادبی ماحول میسّر ہے'۔ جان محمد نے پڑھائی چھوڑ دی اور خود کا بزنس کرنے لگا۔ کمال احمد کے خطوط برابر آتے رہے جس میں علی گڑھ یونیورسٹی کی تہذیبی فضا، وہاں کی تعلیم کا نظم وضبط، وہاں کے طلباء کا لباس اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر ہوتا تھا۔ جان محمد اور میری روٹین میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ہم لوگ پہلے کی طرح ملتے رہے۔ جب اُس کے سمسٹرز کا آخری سال تھا تو اُس کا ایک خط ملا۔ جس میں اُس نے اپنی ایک غزل لکھی تھی اور آخر میں بس اتنا لکھا تھا' یہاں قحط الرجال' ہے۔ غزل مجھے زبانی یاد تھی جسے میں اکثر سُناتا تھا:

یہ آگ ہوگئی بڑی نایاب دیکھنا
دل جل رہا ہے اُس کی تب وتاب دیکھنا
یادیں ہماری تم کو رلائیں گی روز وشب
ہم ہو گئے اگر کبھی نایاب دیکھنا
تہذیب باطنی تو علی گڑھ میں اب کہاں
ظاہر میں ہر قدم پہ ہیں آداب دیکھنا
مسجد نمازیوں سے تو خالی ہوئی مگر
دیوار و طاق و منبر و محراب دیکھنا
کمالؔ! تیرے بعد سخن کی یہ کھیتیاں
سرسبز ہوں گی اور نہ شاداب دیکھنا

دو سال کا عرصہ کیسے بیت گیا پتا ہی نہیں چلا۔ پھر ایک دِن اُس کا خط ملا جس میں تحریر تھا کہ اُس نے اُردو ایم۔اے میں ٹاپ کیا ہے اور اُس کے رشتہ کے ایک چچا کسی سرکاری کالج میں بطور پرنسپل اُسے رکھوا رہے ہیں۔ ہم لوگوں نے بھی اُسے خط لکھ کر مبارک باد دی کہ اُسے حسب خواہش جاب مل رہی ہے۔ دو مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ اُس کا ایک خط ملا جس میں تحریر تھا:

''دوستو! میں واپس آرہا ہوں۔
بعض لڑکیوں کے والدین معترض تھے،
میرے جوان اور کنوارا ہونے پر اس
لیے چقلش سے بچنے کے لیے مُلازمت
سے سبکدوش ہو گیا ہوں۔ جلد ہی اپنے
شہر لوٹ رہا ہوں۔ یہاں آ کر دیکھیں
گے کیا کرنا ہے''

تمہارا اپنا
کمال احمد

مجھے پڑھائی کے دوران ہی ایک پرائیویٹ فرم سے ملازمت کے آفر آنے لگے تھے۔ اس لیے میں نے جاب کر لی اور کمال احمد کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دِنوں کے بعد ہی وہ آ گیا اور آتے ہی اُس نے اپنے ہی کالج میں اپلائی کر دیا۔ ہم سب کو پوری اُمید تھی کہ اُسے ملازمت مل جائے گی کیونکہ اُس کی پرسینیٹیج زیادہ تھی۔

ایک شام جب ہم تینوں قبرستان میں ملے تو کمال احمد کے چہرے پہ اُداسی تھی۔ ''تمہیں کیا ہوا۔۔؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا ہوا کمال ۔۔۔۔۔ آج ستاروں کے مزاج اچھے نہیں'' جان محمد نے بھی کہا۔

اُس نے جواب میں ایک شعر پڑھا:

ٹوٹ جائیں گے تو کرچوں کے سوا کیا دیں گے
کانچ کے پیڑ، خیالوں میں لگایا نہ کرو

آج میں کالج گیا تھا مگر پتا چلا کہ مُلازمت کسی اور کو دے دی گئی'' کمال احمد نے کہا۔

''کیا کالج والوں نے لیٹر نکال دیے ہیں'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔ کل نکلیں گے'' کمال احمد نے کہا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا'' جان محمد نے پوچھا۔

''عبدالغفار نے بتایا ہے'' کمال احمد نے کہا۔

''کون۔۔۔۔؟ وہی جو لیب میں انچارج ہے!'' میں نے تصدیق کی۔ ''ہاں ۔۔۔۔'' اُس نے مختصراً کہا۔

عبدالغفار سے ہماری اچھی علیک سلیک تھی۔ اس لیے اُس نے ہمدردی میں اس کے متعلق اُسے پہلے ہی بتا دیا۔

''کچھ پتا چلا۔ دوسرا کون ہے'' میں نے پوچھا۔

''میں جانتا ہوں ۔۔۔ دوسرا کون ہے؟ رفیق کے علاوہ کوئی نہیں ۔۔۔ وہی ہیرا پھیری کرنے اور نقل کرنے میں ماہر ہے۔۔۔ اور پھر کل میں نے اُسے کالج میں جاتے دیکھا ہے۔۔۔ اُس کا تایا وائس پرنسپل جو ہے۔۔'' جان محمد نے کہا۔ میں نے کمال احمد کی طرف دیکھا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تیسرے روز ہمارے خدشات کی تصدیق ہوگئی کمال احمد کو ملنے والی جاب ہمارے ہی کلاس میٹ رفیق کو مل گئی۔ ہم سب کو اس کا افسوس ہوا مگر یہ جان کر دُکھ اور سوا ہو گیا جب ہمیں عبدالغفار کی زبانی پتا چلا کہ کمال احمد کی عرضی کے ساتھ منسلک دو کاغذات غائب کیے گئے تھے جن کی بنا پر اُس کی میرٹ بنتی تھی۔ یہ جان کر کمال احمد دلگرفتہ ہو گیا۔ میں نے اور جان محمد نے اُس کی دلجوئی کرنے کی بہت کوشش کی مگر اُس کا دِل اُچاٹ ہو گیا تھا۔ ہم لوگ جب بھی ملتے، شاعری کا دور بھی چلتا تھا لیکن اب اُس کی شاعری میں مایوسی، شہر کی بے پرواہی کا غم زیادہ ہوتا تھا۔ ہم سب نے مل کر اُس کی شاعری کی کتاب بعنوان' سوا نیزے کا سورج' بھی شائع کروادی جس کی ادبی حلقوں کی طرف سے کچھ خاص پزیرائی نہیں ہوئی۔ میری اور جان محمد کی شادی ہو گئی۔ معمولات میں تھوڑا سا فرق آ گیا۔ اب ہم ہفتے

کے روز ہی مل پاتے تھے۔کمال احمد نے ایک مدرسے میں اُردو پڑھانے کی وقتی طور پر ملازمت اختیار کر لی۔مگر انتظامیہ سے ناخوش ہو کر وہ جاب بھی چھوڑ دی۔

پھر ایک روز ہمیں پتا چلا کہ وہ شہر چھوڑ کر پاکستان چلا گیا مگر کہاں اس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ہم نے اُس کے گھر کے آس پاس کے لوگوں سے پتا کیا مگر کوئی کچھ نہیں بتا سکا۔ایک صاحب نے بتایا کہ شاید اُس کی ایک پھوپھی ملتان میں رہتی ہے وہاں نہ ہو۔میں نے اور جان محمد نے پاکستان آنے جانے والوں سے پتا کروایا مگر کچھ پتا نہ چل سکا۔والدین اُس کے کب کے فوت ہو چکے تھے۔وہ یہاں اکیلا رہتا تھا۔ بٹوارے میں اُس کے رشتہ دار پاکستان چلے گئے تھے۔اُس کے گھر کو تالا لگا تھا۔ہمیں ایک موہوم سی اُمید تھی کہ شاید وہ کبھی اپنے گھر لوٹ آئے مگر سال پر سال گذرتے گئے مگر وہ نہ آیا اکثر اُس کا ایک شعر میرے ذہن میں تازہ ہو جاتا تھا:

یادیں ہماری تم کو رلائیں گی روز و شب
ہم ہو گئے اگر کبھی نا یاب دیکھنا

اور آج۔۔۔۔۔اتنے سالوں بعد۔۔۔۔۔۔۔۔۔اُس کا خط دیکھ کر پُرانے دن تازہ ہو گئے اور وہ زخم بھی جنہوں نے اُسے اس شہر کو چھوڑنے پر مجبور کیا۔

اچانک دیوار گیر گھڑی میں تین بجنے کا گھنٹہ بجا اور میں چونک کر ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔پورا گھر سنّاٹے میں ڈوبا ہوا لگ رہا تھا مگر ایک آواز اب بھی میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'کمال۔۔۔اوہ کمال۔۔۔کالج نہیں جانا کیا۔۔۔۔۔۔۔۔ میری آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے اور دامن میں جذب ہو گئے۔

☆☆☆

ری میک افسانچہ

الاؤ

(منبع: سہیل عظیم آبادی)

تنویر اختر رومانی

الاؤ کے گرد گاؤں کے پچیس تیس مرد بیٹھے جسم تاپ رہے تھے۔ یہ موسمِ سرما میں روزانہ کا معمول تھا۔نومبر دسمبر میں جب ٹھنڈک اپنے عروج پر ہوتی تو گاؤں کی چوپال کے پاس کی خالی پڑی سرکاری زمین پر،شام ڈھلے الاؤ جلا دیا جاتا۔

اس دن ٹھنڈک کچھ زیادہ تھی۔اس لئے الاؤ کے گرد گاؤں کے لوگوں کی حاضری بھی کچھ زیادہ تھی۔حسب معمول حاضرین کی گفتگو گاؤں کے مسائل پر ہوتے ہوتے ملکی سیاست اور حالاتِ حاضرہ تک پہنچ گئی۔

''بھیّا! یہ سیاست نے نفرت کا جو بیج بویا ہے۔۔۔۔اس کا اثر اب گاؤں دیہات تک پہنچ گیا ہے۔۔۔۔ہمارے گاؤں میں کتنا پریم تھا۔۔۔۔اپنائیت تھی۔۔۔۔ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آتے تھے۔۔۔۔اس میں ہم نہ مذہب دیکھتے تھے اور نہ دھرم۔۔۔۔لیکن اب ماحول کتنا بدل گیا ہے۔'' گاؤں کے ایک بزرگ،شبراتی چاچا نے کہا۔

ان کی باتوں کی تائید کئی لوگوں نے کی جس میں ہندو مسلمان سبھی تھے۔

''اب تو بہت ڈر لگنے لگا ہے۔۔یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور چلے جانے کا جی کرتا ہے۔'' عامر نے کہا۔

عامر کا اتنا کہنا تھا کہ الاؤ کے گرد بیٹھے اکثریتی فرقے کے لوگوں نے پر زور آواز میں احتجاج کرنا شروع کر دیا۔احتجاج اتنا زبردست تھا کہ عامر کی بولتی بند ہو گئی۔

اس نے خاموشی سے،دھیمی ہوتی آنچ کو محسوس کر کے الاؤ کو اپنی چھڑی سے کریدا جس سے انگاروں کا زعفرانی رنگ گہرا ہو گیا۔

بہت دیر تک لوگ عامر کو لعنت ملامت کرتے رہے۔اور رات جب بھیگنے لگی تو لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

دوسری صبح سارے مسلمان عامر کو پورے گاؤں میں تلاش کرتے رہے لیکن نہیں ملا۔اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملا کہ وہ گاؤں سے باہر چلا گیا۔تلاش کرتے کرتے لوگ چوپال تک بھی گئے جہاں الاؤ سرد ہو چکا تھا۔لیکن آج الاؤ کی راکھ اور دنوں سے بہت زیادہ تھی۔

اس واقعے کے بعد گاؤں میں پھر کبھی الاؤ نہیں جلا۔

☆☆☆

یورآنر

شاہد حبیب
ریسرچ اسکالر، مانولکھنؤ کیمپس۔(موبائل:8539054888)

ٹی وی پر چل رہی ایک فلم میں عدالت کے مناظر دیکھ کر پاس میں بیٹھی، میری چھوٹی بیٹی شمی نے پوچھا۔

"پاپا! یورآنر کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

میں نے بتایا۔"جج کو باعزت طریقے سے مخاطب کرنے کے لیے اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے بیٹا!"

اس نے پھر پوچھا۔"جج کو کیوں اتنی عزت دی جاتی ہے پاپا؟"

میں نے کہا۔"تاکہ عدالت میں آنے والے سبھی کا یقین اس بات پر بنا رہے کہ جج جو بھی فیصلہ کرے گا، وہ ثبوتوں اور گواہوں کو مدنظر رکھتے ہوئے برحق فیصلہ کرے گا۔اس اعتراف ویقین کے اظہار کے لیے یورآنر کہہ کر جج صاحب کو مخاطب کیا جاتا ہے۔"

یہ سننے کے بعد شمی نے فلم کے مناظر پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔عدالتی کارروائی کے ختم ہونے پر جب جج کے فیصلے سے مطمئن ہو کر سبھی فریق اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تو شمی نے کہا۔"پاپا! آپ نے یورآنر کا جو مطلب بتایا تھا، اسے میں اب اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔"

صبح اٹھ کر شمی اسکول چلی گئی اور میں اپنے آفس۔جب شام کو میں آفس سے لوٹا تو شمی کو پھر سے ٹی وی کے سامنے پایا۔تھوڑا فریش ہو کر بیگم کو چائے کا کہہ کر شمی کے پاس جا بیٹھا اور ریموٹ اپنے ہاتھ میں لے لیا تو شمی نے کہا۔"پاپا! پلیز، چینل مت چینج کیجئے گا۔"

میں نے کہا۔"اس نیوز چینل کی خبروں میں ایسا تمہیں کیا نظر آ گیا بیٹا کہ تم اتنی توجہ سے اسے دیکھنے لگیں؟"

شمی نے کہا۔"ایک بار آپ خبر دیکھیے تو سہی پاپا۔"

اس کے اس طرح کہنے پر جب میں نے خبر پر نظریں مرکوز کیں تو دل دھک سے ہو اٹھا۔کل رات ایک جج صاحب کی حرکت قلب بند ہو جانے سے مرنے کی خبر پر ڈبیٹ چل رہی تھی، جس میں اپوزیشن جماعت کے ترجمان کا کہنا تھا کہ حکمراں جماعت کے قدآور رہنما کے مقدمے کی سماعت مکمل ہو گئی تھی اور غالب امکان تھا کہ اگلی تاریخ کو قائد موصوف کے خلاف جج صاحب کی عدالت سے فیصلہ آنا تھا۔اس لیے جان بوجھ کر قائد موصوف نے جج صاحب کو مروانے کی سازش رچی اور اسی کے نتیجے میں جج صاحب نے اپنی جان کی قربانی دے دی جبکہ حکمراں جماعت کا ترجمان اس طرح کے تمام امکانات کی نفی کر رہا تھا اور سی بی آئی سے جانچ کرائے جانے کی مخالفت بھی۔

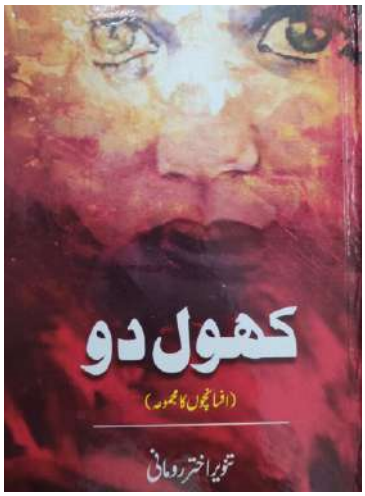
شمی نے ان خبروں سے نظریں ہٹاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا؛ پاپا! یورآنر کا مطلب کسی زمانے میں عزت واعتراف سے جڑا رہا ہوگا لیکن آج تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اگر آپ میرے حق میں فیصلہ سناتے ہیں تو ہم آپ کی عزت بھی کریں گے اور آپ کو گورنر وغیرہ بھی بنا دیں گے ورنہ۔۔۔۔۔۔"

چھٹے کلاس میں پڑھ رہی شمی کی زبانی 'یورآنر' کا یہ مطلب سن کر میرے پاس اس کی تردید کے لیے کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

تبصرہ

نام کتاب: کھول دو (افسانچوں کا مجموعہ)



مصنف : تنویر اختر رومانی
(موبائل:8092792511)

مبصر : ڈاکٹر سلیم احمد

قیمت : ۲۰۰/روپے

اشاعت : ۲۰۲۲

صفحات : ۱۲۸

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

عہد ماضی میں جب انسان کے پاس فرصت ہی فرصت ہوا کرتی تھی اور تفریح کے ذرائع محدود تھے تو قصہ گوئی ہی دلچسپی اور دلجوئی کا بہترین ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ اس وقت کے قصہ گو ایک دو دن میں نہیں بلکہ مہینوں تک کڑی سے کڑی ملاتے چلے جاتے تب کہیں جا کر قصے کا اختتام ہوا کرتا تھا۔ قصہ گل بکاؤلی، حاتم طائی، طوطا مینا سے ہوتا ہوا داستان امیر حمزہ، عمرو عیار اور باغ و بہار و رانی کیتکی جیسے قصے اور کہانیوں کا وجود اسی عہد کی یاد دلاتے ہیں۔ آج سے تین دہائی قبل تک جاسوسی اور تاریخی ناول بے حد دلچسپی اور شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ ناولٹ اور افسانے بھی لکھے جاتے رہے۔ مگر عہد حاضر میں انسان کی مصروفیت اس قدر بڑھ گئی کہ اسے طویل افسانے اور ناول پڑھنے کی فرصت ہی نہیں۔ اسی مجبوری کے بطن سے افسانچہ وجود میں آیا۔ اور فی الوقت افسانچوں میں قاری کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے کیونکہ قاری کم وقت میں پوری کہانی سے لطف اندوز ہو جاتا ہے۔ افسانچہ کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے شاعر ایک شعر میں پورے واقعے کو قلم بند کر دے۔

ادھر افسانے کے ساتھ ساتھ افسانچہ بھی تیزی سے لکھا جانے لگا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ طویل افسانوں اور ناولوں کی بہ نسبت افسانچے میں قاری زیادہ دلچسپی لینے لگا ہے، اس لیے اس وقت ہمارے فنکاروں کی ایک بڑی جماعت افسانچہ نگاری کی طرف توجہ دے رہی ہے اور اچھے افسانچے لکھے بھی جا رہے ہیں۔ انھیں افسانچہ نگاروں میں ایک نام تنویر اختر رومانی کا بھی ہے۔ تنویر صاحب گزشتہ چار دہائیوں سے افسانچہ لکھ رہے ہیں جو وقتاً فوقتاً مؤقر رسالوں اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ ان افسانچوں کا انتخاب کر کے اور کچھ نئے افسانچے شامل کر کے انھوں نے ۲۰۲۲ میں ''کھول دو'' کے نام سے اپنا پہلا مجموعہ شائع کرایا۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں ۱۲ / مشاہیر افسانہ نگاروں کے ریمیک افسانچے شامل ہیں جبکہ دوسرے حصے میں ۵۲ /طبعزاد افسانچے مجموعے کے وقار میں اضافہ کر رہے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ گزشتہ چار دہائیوں میں تنویر صاحب نے بہت سے افسانچے لکھے مگر اس کتاب میں انھوں نے وہی افسانچے شامل کئے ہیں جو قارئین کی دلچسپی کا باعث بنیں گے۔ کتاب میں شامل افسانچوں کا آغاز سعادت حسن منٹو کے ایک ری میک ''کھول دو'' سے ہوتی ہے اور اسی عنوان کو تنویر اختر رومانی نے کتاب کا نام بھی دیا ہے۔

سعادت حسن منٹو، غیاث احمد گدی، منشی پریم چند، احمد ندیم قاسمی، راجہ یوسف، غلام عباس، محمد حسن، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے افسانوں کے ری میک افسانچے تنویر اختر نے بڑی کامیابی کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔ اس ضمن میں وہ تحریر کرتے ہیں:

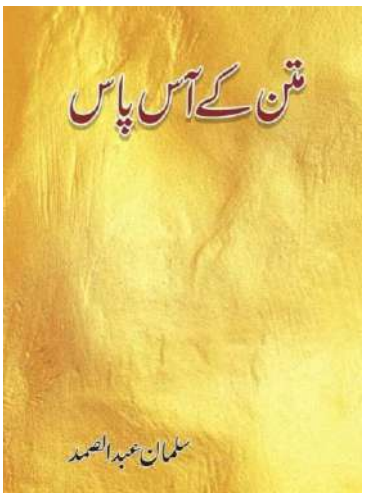
''اس مجموعہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں اردو کے بارہ مشہور و معروف افسانوں کی ری میک افسانچے ہیں۔ میں نے افسانچے کے باب میں یہ ایک تجربہ کیا ہے''۔

تنویر صاحب کا یہ تجربہ کتنا کامیاب ہوگا یا وہ اس تجربے میں وہ کہاں تک کامیاب رہے اس کا صحیح فیصلہ قارئین ان افسانچوں کو پڑھ کر بخوبی کر سکتے ہیں۔ لیکن اتنا ضرور عرض ہے کہ کئی افسانچوں کے پنچ لائن سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

☆☆☆

تبصرہ

نام کتاب: متن کے آس پاس



مصنف : سلمان عبدالصمد

مبصر : پروفیسر غضنفر علی

قیمت : ۲۰۰/روپئے

اشاعت : ۲۰۲۳

صفحات : ۲۳۲

ناشر : مرکزی پبلیکیشنز، نئی دہلی

(موبائل:9811794822)

(تنقیدی مضامین)

بیشتر نئی تحریروں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ رخشِ خامہ جوش جنوں میں متن کے پاس سے دور چلا گیا ہے یا وفورِ شوق، نگارش میں روش سے بھٹک گیا ہے مگر سلمان عبد الصمد کی تحریروں کی ورق گردانی کے وقت یہ لگتا ہے کہ ان کا قلم متن کے آس پاس موجود ہے۔ اور اس کا سبب شاید یہ ہے کہ وہ متن کے مخفی مفاہیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے جن چند نئے قلم کاروں کے سینے میں تخلیقی آگ روشن ہے اور جن کے خامے کی سیاہی سے چنگاریاں جھانکتی ہیں اور ان چنگاریوں میں خون جگر کی سرخی شامل ہے ان میں سلمان عبدالصمد بھی ایک ہیں۔

سلمان کو ایک اضافی استعداد یہ بھی حاصل ہے کہ ان کے پاس تخلیقیت کے ساتھ تنقیدی بصیرت بھی موجود ہے جو ان کو متن کے آس پاس سے ہٹنے نہیں دیتی۔ ساتھ ہی مدرسے کا وہ بیک گراونڈ بھی ان کے پاس ہے جو طالب علم کو اردو زبان سے اتنا قریب کر دیتا ہے کہ غرابت دور ہو جاتی ہے اور اس میں ایسی قوت گویائی اور طلاقت لسانی بھر دیتی ہے کہ طالب علم کی اپنی علاقائی بولی کا زور بھی رفتارِ زبان، اردو کی روانی کو روک نہیں پاتا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ زبان وادب کے تئیں سلمان کے رویے میں نماز والے خشوع وخضوع جیسا انہماک اس کی ادبی ریاضت کو عبادت جیسا بنا دیتا ہے۔

سلمان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب وہ ادب شناسی کی نیت باندھتے ہیں تو ان کی نظر کے سامنے متن ہوتا ہے۔ وہ پورے وقت متن کے مال ومنال پر اپنی نظر مرکوز رکھتے ہیں۔ مراقبے جیسے استغراق کے باعث ان کی نگاہ میں فن پارہ پوری طرح سمٹ آتا ہے اور اس کا حسن ان کے تنقیدی شعور اور طلاقت لسانی کے رنگ ونور سے آراستہ ہو کر آئینہ ءقرطاس میں منعکس ہو جاتا ہے۔ آئینے میں ابھرے عکس پر نگاہ مرکوز کیجیے تو امیر خسرو، ولی، حالی، اقبال، منٹو، اکبر، فاروقی پیغام وغیرہ کے افکار و نظریات اور محسوسات و مشاہدات کے خدوخال دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اور یہ بھی محسوس ہونے لگتا ہے کہ سلمان کی نگاہ متون کے بطون میں کہاں کہاں تک پہنچتی ہے۔ حواشی اور حوالوں سے یہ بھی جھلکتا ہے کہ سلمان کی نظریں مآخذ تک بھی رسائی حاصل کرتی ہیں اور اور ان کا معروضی ذہن استنباط واستدلال سے کام لے کر ادب پارے کی قدر و قیمت کے تعین میں کسی منطقی انجام تک جا پہنچتا ہے۔ ان کے تجزیاتی عکوس سے یہ حقیقت بھی مترشح ہوتی ہے کہ سلمان کا ذہن اپنے خمیر میں بے باکانہ وصف رکھتا ہے جو کسی بھی طرح کی خارجی یا داخلی دباؤ کی زد میں نہیں آتا اور وہی کہتا ہے جو اس کا ضمیر چاہتا ہے یا اسے کہنے کے لیے کہتا ہے۔

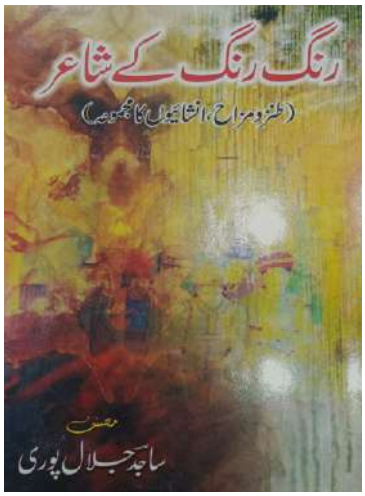
کتاب کے شروع میں جو سلمان نے اپنے بارے میں لکھا ہے وہ اس کی عملی تحریروں میں دکھائی بھی دیتا ہے۔ پرتوے تحریر سے اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ معاشرتی اور معاشی دباؤ کے باوجود سلمان کی شخصیت کی دبازت دب نہیں پاتی۔ وہ ہر حال میں اپنی خوئے بے خوفی کو بچا کر رکھتے ہیں اور علامہ اقبال کے ایک مشہور مصرعے کی سچائی کو ثابت کر دیتے ہیں۔

سلمان نے پیغام آفاقی کے ناول "دوست" کے مقدمے کی پیروی بھی اچھی کی ہے تا کہ دوست کی سنوائی اچھی طرح ہو جائے اور فیصلہ پیغام کے حق میں لکھ جائے مگر افسوس کہ منطقی جرح اور اچھی دلیلوں کے باوجود دوست کے مقدمے کو غور سے نہیں سنا گیا اور وہ جس فیصلے کا حق دار تھا وہ فیصلہ اس کے حق میں نہ ہو سکا مگر میری طرف سے پیغام کو داد کے ساتھ ساتھ کہ اس نے مکان کے بعد ایک اور نئے انداز کا ناول اردو ناول نگاری کی جھولی میں ڈال دیا، عزیزی سلمان عبد الصمد کو بھی داد ومبارک باد کہ انھوں نے میرے دوست کے "دوست" کو فائلوں کے ملبے سے نہ صرف یہ کہ باہر نکال لیا بلکہ جھاڑ پونچھ کر اسے چمکا بھی دیا۔ اب اگر کوئی اس دوست کے روشن چہرے کو نہ دیکھنا چاہے تو قصور دیکھنے والے کی آنکھوں کا ہے یا پھر اس کی نیت کا۔

☆☆☆

تبصرہ

کتاب: رنگ رنگ کے شاعر



مصنف : ساجد جلال پوری
(موبائل:917571867185)

مبصر : ڈاکٹر سلیم احمد

قیمت : ۱۵۰/روپئے

اشاعت : ۲۰۲۲

صفحات : ۲۲۴

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

کسی واقعہ یا لمحاتی کیفیت کو اس طرح پیش کیا جائے کہ قاری اس سے محظوظ ہو جائے، انشاء پردازی کہلاتی ہے۔ اس کے لیے انشائیہ نگار اپنی صلاحیت، شخصیت اور مہارت کو بلا قید آزادانہ طور پر تحریر کرتا ہے کیونکہ انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جس کے لیے کوئی شرط نہیں ہوتی یعنی بلا شرط ہی انشائیہ کی شرط ہے۔ اور اس میں یہ شرط نہیں کہ انشائیہ نگار مضمون کو کسی نتیجہ پر ختم کرے۔ موضوع کی بھی کوئی قید و بندش نہیں ہوتی مجموعی طور پر انشائیہ نگار اپنی بات آزادانہ طور پر بے باکی، بے تکلفی اور بے حد دل چسپ انداز میں صفحہ قرطاس پر طنز و مزاح کے تڑکے کے ساتھ بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ ایک کامیاب انشائیہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی انشائیہ نگاری کے ذریعہ قاری کو تنہائی میں سوچنے اور ہنسنے پر مجبور کر دے۔ یہ فن پڑھنے میں جتنا آسان ہے اتنا ہے نہیں یہ ایک مشکل فن ہے اس میں صلاحیت، مطالعہ، مشاہدہ طنز اور مزاح مرکب ہوتا ہے اسی لیے اس فن پر کم لوگ طبع آزمائی کرتے ہیں۔

ایسے ہی ایک نوجوان انشائیہ نگار ہیں عزادار حسین ساجد جلال پوری، جن کا تعلق اتر پردیش کے ضلع امبیڈکر نگر سے ہے، ان کی شخصیت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ایک شاعر بھی ہیں اور شاعروں کے تمام عیوب و محاسن سے واقف ہیں شاید یہی وجہ ہے انھوں نے شاعروں کے موضوع کا انتخاب کیا اور اسے ۲۶ مختلف عنوانات سے انشائیوں کے ذریعہ پیش کیا۔ دراصل میں بات کر رہا ہوں ساجد جلال پوری کی کتاب ''رنگ رنگ کے شاعر'' کی جو ان کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کا انتساب 'حیوان ظریف' مرزا اسد اللہ خاں غالب، مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین کے نام سے ہے۔ مشمولات میں اردو ادب کی نامور شخصیات پروفیسر شارب ردولوی اور پروفیسر علی احمد فاطمی نے ساجد جلال پوری کی انشائیہ نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اس کتاب کی اشاعت پر انھیں مبارک باد دیتے ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ:

> ''مشفق خواجہ نے خاص طور سے اپنے کالم میں شعراء ادبا اور ان کی کتابوں کو موضوع بنایا اور ایسے دلچسپ مضامین لکھے کہ تنہائی میں آدمی پڑھے تو ہنسی نہ روک سکے کیوں کی انھیں دکھتی نس پکڑنے کا ہنر آتا تھا۔ مجھے امید ہے کہ ساجد جلال پوری بھی وہ ہنر اپنے اندر پیدا کرنے میں کامیاب ہوں گے۔''

اس کے علاوہ پروفیسر عباس رضا نیر جلال پوری کے تفصیلی مقدمہ سے ساجد صاحب کی شخصیت اور انشائیہ نگاری کو سمجھا جا سکتا ہے۔ شعراء سے متعلق مختلف انشائیوں پر مشتمل اس کتاب میں استاد الشعراء، اشتہاری شعراء، خاندانی شعراء، سیاسی شعراء، درباری شعراء، تجارتی شعراء، خوش خوراک شعراء، شاعر احساس برتری، شاعر بلا معاوضہ، شاعر اکھاڑہ جیسے دو درجن سے زیادہ انشائیے شامل ہیں۔ رنگ رنگ کے شاعر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کتاب کے مطالعہ میں قاری کی دلچسپی مسلسل بنی رہتی ہے جو ایک کامیاب انشائیہ نگار کی پہچان ہوتی ہے۔ اس کی وجہ انشائیہ میں غزل کا سا انداز اور حکیمانہ نزاکت کے ساتھ بھرپور مزاح اور طنز ہے۔

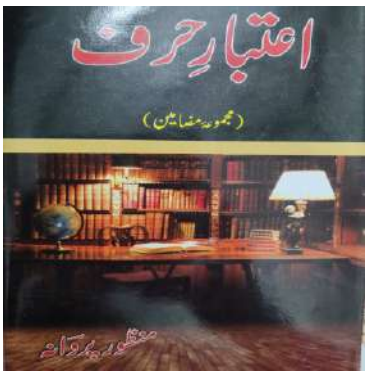
اقتباس سے عیاں ہے کہ ساجد کے انشائیہ میں طنز و مزاح بھی ہے اور بے باکی بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ساجد کے انشائیہ میں وہ تمام خوبیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جو ایک کامیاب انشاء پرداز میں ہونی چاہیے حالانکہ ''رنگ رنگ کے شاعر'' ان کی پہلی کتاب ہے اور چونکہ ساجد صاحب شاعری کا بھی شغف رکھتے ہیں اس لیے وہ ان موضوعات کو بہتر انداز میں برتنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہیں پر ''خوش پوشاک شاعر'' سے یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمالیں:

''زمانہ آگے بڑھا، یا شاعروں کی نسل آگے بڑھی تو انھوں نے زمانے کے حساب سے خود کو تبدیل کرلیا۔ چونکہ صرف گرگٹ ہی نہیں زمین وآسمان بھی جب اپنا رنگ بدلتے ہیں تو شاعر اپنا فیشن کیوں نہ بدلیں۔اسی لیے نوجوان شعرا کرتا پائجامہ ترک کر کے پینٹ شرٹ اور جینس ٹی شرٹ پہن کر میدان میں آ گئے او ر اس کے جواز میں اتنی خوبصورتی اور صفائی سے دلیل دی کہ ان کی صفائی کی دھمک اور بھنک حکومت کے کانوں تک پہونچ گئی اور ان کو ''سوچھ بھارت ابھیان'' کے ''برانڈ امبیسڈر'' کے طور پر منتخب کرلیا گیا اس لئے اب ان کو نہ صرف وہاں سے امداد ملتی ہے بلکہ مشاعروں میں داد بھی ملتی ہے''

ان اقتباسات سے ساجد جلالپوری کی زبان و بیان ، طنز و مزاح، صلاحیت اور شخصیت کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے ۔ مجموعی طور پر آپ یہ سمجھ لیجئے کہ رنگ رنگ کے شاعر میں شامل تمام انشائیے طنز و مزاح اور الفاظ کی جادوگری سے بھرپور ہیں ۔ یہ کتاب نہ صرف پڑھنے کے لائق ہے بلکہ گھر کی بک شیلف کی زینت میں اضافہ بھی کرے گی۔کتاب کی حصولیابی کے لیے ساجد جلال پوری سے موبائل نمبر 917571867185 پر رابطہ قائم کر کے 150 روپے میں حاصل کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

تبصرہ



مصنف : منظور پروانہ
مبصر : ڈاکٹر قدسیہ بانو
قیمت : ۳۰۰/روپئے
اشاعت : ۲۰۲۲
صفحات : ۲۹۶
ناشر : نعمانی پرنٹنگ پریس، لکھنؤ

منظور پروانہ اردو کی ادبی دنیا کیلئے ایک شناسا نام ہے۔جن افراد کو بھی کتب بینی اور اخبار بینی کا شوق وشغف ہے وہ ان سے اور انکی علمی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہوں گے۔ اپنے افسانوں اور مضامین کی وجہ سے انھوں نے اردو کے ادبی ماحول میں اپنی ایک مخصوص جگہ بنائی ہے۔منظور پروانہ واقعی عاشق اردو ہیں اسی لئے دوران ملازمت اور سکبدوشی کے بعد انہوں نے خدمت اردو کا نہ صرف قلمی فریضہ انجام دیا بلکہ اس کا عملی ثبوت بھی پیش کیا۔ چاہے امین آباد میں مشہور صحافی اور ادیب عابد سہیل کی اردو کتابوں کی دکان رہی ہو یا اب دانش محل۔منظور پروانہ صاحب سے ملاقات یقینی ہے۔وہ جتنے اچھے قلم کار ہیں اتنے ہی نفیس انسان بھی۔ بات کرتے ہیں تو گویا پھول جھڑتے ہیں لیکن تحسین ناشناس کو انہوں نے کبھی اپنا شیوا نہیں بنایا یہی وجہ ہے کہ شہر ادب لکھنؤ میں ان کے دوست کم ہی ہیں۔

آیئے تھوڑی گفتگو ان کی زیر تبصرہ کتاب ''اعتبار حرف'' کے حوالے سے کرلی جائے۔ یہ کتاب منظور پروانہ صاحب کے مختلف نوعیت کے مضامین پر مشتمل پہلی کتاب ہے جس میں قارئین کو زبان کے چاشنی کے ساتھ عصر حاضر کے ان شخصیتوں سے ان کے ادبی کمال کے ساتھ روبرو ہونے کا موقع ملے گا جن سے ان کی ملاقات تو بار بار ہوتی ہے لیکن بطور ادیب وشاعر ان کے علمی وفنی کمالات سے شاید آگاہی نہ ہو۔

''اعتبار حرف'' کے صفحہ نمبر 7 پر 'مجھے کچھ نہیں کہنا' کے معنی خیز عنوان سے صرف پانچ سطریں لکھ کر انہوں نے بہت کچھ کہہ دیا یعنی یہ کتاب ان کے تعارفی ،تاثراتی ،تبصراتی اور تجزیاتی مضامین کا حسین گلدستہ ہے اب قاری کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ اس کو اپنے پسندیدہ کس پھول کی خوشبو سے اپنی روح کو موتر کرنا ہے۔

اعتبار حرف میں ۴۲ مضامین ہیں جسکی احاطہ بندی ۲۹۶ صفحات میں کی گئی ہے۔ یہ ۲۹۶ صفحات گویا باغ تازہ کی وہ آراضی ہے جس میں مختلف قسم کے پھول کھلے ہیں کہیں شاہ نواز قریشی کے نام کا پھول ہے تو کہیں راجیو پرکاش ساحر ،تو کہیں ایچ ایم یسٰین، رحمت لکھنوی، سنجے مصرا، انس مسرور انصاری اور خالد فتح پوری یہ وہ پھول ہیں جنکی خوشبو آپ کے ذہن ودل کو معطر کردے گی۔

میرا ایک مشورہ ہے کہ شامل کتاب مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا ایک حصہ لکھنؤ اور آس پاس کے ادبا وشعرا پر مشتمل ہوتا اور دوسرے حصہ میں امداد امام اثر، ڈاکٹر سلام سندیلوی، منشی نول کشور غیرہ کو شامل کیا جاتا۔ اچھے کاغذ ۲۹۶ صفحات اور/ ۳۰۰ روپے مناسب قیمت والی کتاب ''اعتبار حرف'' اردو کے ادبی حلقہ میں ضرور پسند کی جائے گی۔ میں شاندار اور کارآمد کتاب کی اشاعت کیلئے منظور پروانہ کی کاوشوں کی ستائش گزار ہوں۔ ☆☆☆

تبصرہ

کتاب: عروس لفظ کا مسکن لکھنؤ

مصنف	:	رضوان فاروقی
مبصر	:	ڈاکٹر رضوان انصاری
قیمت	:	۲۰۰/روپئے
اشاعت	:	۲۰۲۱
صفحات	:	۲۱۶
ملنے کا پتہ	:	دانش محل، امین آباد، لکھنؤ (موبائل:9792361533)

لکھنؤ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے پوری دنیا میں ایک لاثانی شہر کے بطور دیکھا جاتا ہے جہاں کی علمی و ادبی خدمات لاجواب ہیں ساتھ ہی تہذیب وتمدن بھی بے مثال ہے ۔گرچہ اسے عالم میں انتخاب نہیں کہا گیا لیکن اس سے یہ کسی صورت کم بھی نہیں ہے۔لکھنؤ سے وابستہ رضوان احمد فاروقی بھی ہیں جو صاحب علم، دانشور، خوش فکر شاعر اور قادرالکلام نثر نگار ہیں۔ یہ روز بروز نئے نئے موضوعات پر اشہبِ قلم کو دوڑانے کا ملکہ رکھتے ہیں۔

زیر نظر کتاب ''عروس لفظ کا مسکن لکھنؤ''، میں کل ۱۲ /عناوین پر شعرائے لکھنؤ کے کلام کو سجا کر پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ۵ / صاحبانِ علم کے تاثرات بھی کتاب کی زینت ہیں جس میں کتاب کی انفرادیت اور صاحب کتاب کی خلاقانہ طبیعت پر راشنی ڈالی گئی ہے۔ جب کہ ''کتاب کے اوراق پر ابھرنے والے کردار'' اور ''کچھ نیا کرنے کی کوشش'' کے عناوین کے تحت خود رضوان فاروقی نے اپنا مدعا بیان کیا ہے۔رضوان فاروقی نے پہلے عنوان کے تحت لکھنؤ کے ان دانشوروں اور شعروادب کے ستاروں کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر کتاب کے اوراق پر بار بار آیا ہے۔ رضوان فاروقی نے ''کچھ نیا کرنے کی کوشش'' کے تحت کتاب کی وجہ تسمیہ، کتاب کے وقوع میں آنے کا سبب اور بزم صفی (جدید) کی شعری نشستوں کی انفرادیت کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی کتاب پر مقدمہ لکھنے والی شخصیات کے لیے تشکر کا اظہار بھی کیا ہے۔ یہ خبر نئی ہے کہ بزم صفی کی ماہانہ نشستوں میں مصرح طرح کے بجائے دیئے گیے ردیف کے تحت شعر کہنے کی روایت شروع کی گئی تھی جو بے حد مقبول ہوئی اور لکھنؤ وقرب وجوار کے شعراء اسی ردیف میں جو شعر پیش کرتے، ان ہی کی تفصیلی رپورٹ رضوان فاروقی نے ترتیب دیئے اور روزنامہ آگ اور دیگر اخبارات میں شائع کرائے۔ ان ہی شائع شدہ رپورٹس کی مجموعی شکل ہے زیر نظر تالیف ''عروس لفظ کا مسکن لکھنؤ''۔کتاب میں شامل ۱۲ تخلیقی رپورٹس کے عنوانات ہی دراصل وہ ردیف ہیں جن پر بزم صفی (جدید) کی نشست میں پیش کرنے کے لیے اشعار کہے گئے، وہ اس طرح ہیں:

لکھنؤ، زندگی، بادل، دھوپ، خوشبو، کتاب، ماں، منظر، محبت، ناممکن، ضرورت اور رمضان۔

ان عناوین پر بزم صفی (جدید) کی مجلسوں میں شریک ہونے والے شعراء کرام نے طبع آزمائی کی اور اپنے اپنے کلام سے نشستوں میں شعراء اور موجود سامعین کو محظوظ کیا۔جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ان محفلوں میں شعراء کو مصرعہ طرح کے بجائے ردیف دیا جاتا۔ بحر وغیرہ کی کوئی پابندی نہیں رکھی گئی۔اس طرح شہر اور بیرون شہر کے شعراء شامل نشست ہو کر اپنا کلام پیش کرتے۔رضوان فاروقی نے جس کمال طریقے سے شعراء کے اشعار کو کتاب کی زینت بنایا وہ واقعی بے مثال ہے۔ اگر ان رپورٹس میں سے چنیدہ اشعار بھی بطور تمثیل یہاں پیش کیے جائیں تو تبصرہ کے بجائے مقالہ تیار ہو جائے گا۔ اس لیے اصل کتاب کا مطالعہ ضروری بھی ہے اور باعث انبساط بھی۔فاروقی کو ہندی الفاظ کی آمیزش سے جملے بنانے کا ہنر خوب آتا ہے۔ چنانچہ 'ماں' کے حوالے سے لکھے گئے مضمون میں منور رانا کے شعر کے ضمن میں جو بات کہی گئی ہے، اس میں ہندی الفاظ کی خوبصورت آمیزش کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ایک مثال ملاحظہ ہو:

''چشمۂ ایثار ومحبت اگر کوئی ذات ہے تو وہ ماں ہے۔ دنیا کی محبت کے رنگ انیک ہیں مگر ماں کی محبت کا رنگ ایک ہے۔''

''منور رانا کی ہر غزل میں ماں کی محبت کے مختلف روپ آپ کو جگمگاتے نظر آئیں گے۔۔۔۔۔وہ کبھی کسی حال میں ماں کے ذکر سے اکتاتے نہیں۔اسی لیے قسمت کی دیوی ان پر مہربان ہے۔ماں کے حوالے سے وہ شہرت کی بلندیوں پر براجمان ہیں''

ان دونوں اقتباس میں ہندی کے الفاظ کا استعمال ہوا ہے جو ان کی فکر کی روانی پر دال ہے۔اسی طرح رضوان فاروقی نے اپنی زبان کی چاشنی کو ان رپورٹس میں اس طرح مدغم کیا ہے کہ یہ محض کسی شعری نشست کی رپورٹ نہ رہ کر تخلیقی مضمون کے زمرے میں داخل ہوگئی ہیں۔

حاصل مطالعہ یہ ہے کہ رضوان فاروقی کی نثر میں انفرادیت ہے اور کلام میں ندرت کا عنصر ملتا ہے۔کچھ نیا کر دکھانے کا جذبہ رکھتے ہیں جس کی شاہد اس کتاب کے صفحات ہیں۔اس لیے امید کی جاتی ہے کہ لکھنؤ کی ادبی فضا کو سمجھنے کی خواہش رکھنے والے قارئین اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔یقین ہے کہ ایک عرصہ بعد اس کتاب کو لوگ ایک دستاویز کے طور پر دیکھنا شروع کردیں گے۔

☆☆☆



محترم ڈاکٹر سلیم احمد صاحب۔!
محترم شاہد حبیب صاحب۔!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ادبی نشیمن بابت دسمبر 22 تا فروری 23 موصول ہوا۔ تشکرات۔ سرورق پر شائع شدہ نظم جلال حسن اپنے تیور کی مناسبت سے جلالِ حُسن کا تاثر پیش کرتی ہے ۔ جس کی جزویات سے فلسطینی فضا مترشح ہوتی ہے ۔ ممکن ہے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے درست نہ ہو لیکن ہو نہ ہو موجودہ حالات کے پیش نظر اُسی خمیر سے اُٹھا گئی ہو۔ دیگر مقالات ومنظومات کا افسانوی تخلیقات بھی اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی آپ حضرات کی محبتوں اور محنتوں سے رسالہ کا معیار مسلّم ودو چند ہو گیا ہے۔

ہدیۂ تبریک۔ والسلام

حبیب راحت حبابؔ، کھنڈوہ (ایم پی)

محترم ڈاکٹر سلیم احمد صاحب!

سلام مسنون

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ سہ ماہی ادبی نشیمن کا تازہ شمارہ (دسمبر ۲۰۲۲ء تا فروری ۲۰۲۳ء) باصرہ نواز ہوا۔ سب سے پہلے میں آپ کو اور ادبی نشیمن کے پورے عملے کو رسالہ کے پانچ سالہ کامیاب سفر پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آپ نے اپنے اداریہ میں اردو محافظ دستہ کے جن دو غیر مسلم رضا کاروں کا ذکر خیر کیا ہے آج کی نئی نسل ان کے نام تک سے واقف نہیں ہے۔ پنڈت دیونارائن پانڈے اور جے بہادر سنگھ ایسے شیدائے اردو تھے جنھوں نے اردو کے لئے اپنی جان دے دی اور ہم ہیں کہ ان کے نام تک بھول گئے۔ آپ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ اردو تحفظ کی تاریخ میں کوئی اور نام نہیں ملتا جس نے اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے نام پر جان کی قربانی دی ہو۔ ایسے مجاہدین اردو کو یاد رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اس سلسلہ میں آپ نے جو تجویز پیش کی ہے۔ میں اس کی پرزور تائید کرتا ہوں کہ عالمی یوم اردو کے ساتھ ۲۰ر مارچ کو یوم تحفظ اردو کے طور پر بھی منایا جائے۔ اس شمارے میں آپ نے اردو دنیا کی تین شخصیات رباب رشیدی، پروفیسر اصغر عباس اور رفعت عزمی کو جس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ لائق تقلید ہے اس سلسلے کے مضامین بہتر ہیں۔ گوشۂ مضامین بہت خوب، افسانے بھی لائق مطالعہ، شعری حصہ بھی اچھا ہے۔ یہ تمام گوشے آپ کے حسن انتخاب کا بین ثبوت ہیں۔

تبصرے کے گوشے میں ''کلیات آرزو لکھنوی'' پر محسن عظیم انصاری کا تبصرہ پڑھ کر بے ساختہ منھ سے نکلا اللہ کرے ثقیل اردو اور زیادہ۔

آخر میں ایک گذارش کہ پروف پڑھنے پر اور زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس شمارے کے صفحہ ۲۸ر پر ڈاکٹر ناظم حسین خان کا مضمون ''اکبر الہ آبادی کا نظریۂ فکر اور شاعری'' شامل ہے مگر فہرست عنوانات میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس وجہ سے فہرست تو نامکمل ہے ہی ساتھ ہی دوسرے مضامین کے سامنے جو صفحہ نمبر دئے گئے ہیں وہ بھی غلط ہو گئے ہیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ

منظور پروانہ

دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

موبائل:9452482158

محترمی ومکرمی ڈاکٹر سلیم احمد صاحب

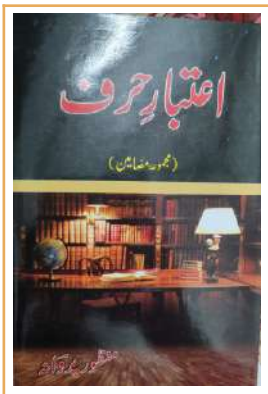
مدیر، سہ ماہی ادبی نشیمن، لکھنؤ تسلیمات

ادبی نشیمن کا تازہ شمارہ (دسمبر تا فروری 2023) دستیاب ہوا۔ اچھا لگا دیکھ کر کہ آپ نے بڑی محنت سے رسالے کو سجایا ہے۔ سرورق پر بہادر بیٹی ''مسکان'' کی الوسٹریٹڈ تصویر شائع کر کے آپ نے عمدہ انداز میں خراج تحسین پیش کی ہے ۔ یہ ایک طرح سے پوری ادبی برادری کی طرف سے فرض کفایہ کی ادائیگی ہے۔ اس پر آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہے۔ سبھی مضامین، افسانے اور غزلیات عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ ہجور آما پر ڈاکٹر سفینہ بیگم کا مضمون اور بہار میں جدید غزل گوئی پر ڈاکٹر محمد شرف عالم کا مضمون بے حد پسند آئے۔ غالب کے سفر کلکتہ کے حوالے سے لکھا گیا مضمون بھی اچھا لگا۔ اشفاق برادر کا افسانہ ''تجارت'' اور تنویر اختر رومانی کا افسانچہ ''بھگوان کی دیوالی'' نے سوچ کے دروازے کھولے۔ دیپک روحانی، نوشاد اشہر اور شمیم احمد شمیم کی غزلیں پڑھ کر مزہ آیا۔ جمیل اختر شفیق کی نظم نما غزل ''سجدے میں'' پڑھ کر زبان پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوا۔ خووب ۔۔ ان تمام کی خدمت میں مبارک باد پیش ہے۔ ادبی نشیمن کے پانچ سال مکمل ہونے پر جس طرح دل کھول کر ماہرینِ زبان وادب نے تعریف کی اور اپنے پیغامات بھیجے، اسے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ادبی نشیمن کی کوششوں کی تحسین ہو رہی ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی صاحب، پروفیسر شمس الہدیٰ صاحب اور دیگر معززین کے لیے ہمارے دل میں مزید احترام کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ امید ہے ادبی نشیمن یوں ہی اپنے معیار و وقار کو بلند کرتا رہے گا۔ شکریہ

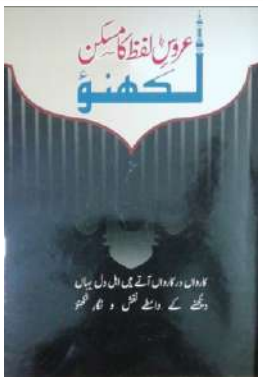
انوار الحق

ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ

موبائل:6393395865

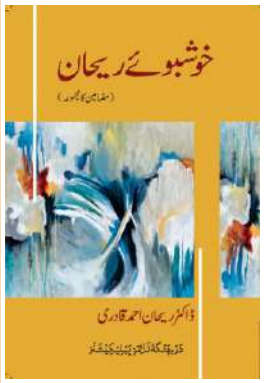


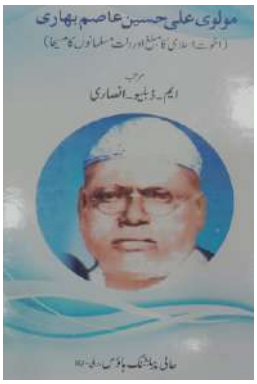


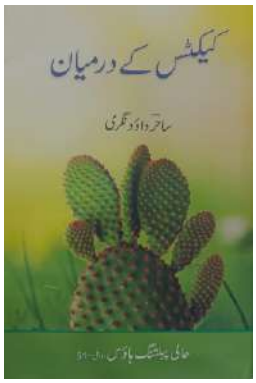














لکھنؤ کی ادبی وثقافتی تنظیم سلام لکھنؤ کی جانب سے ''فخرِ اودھ'' ایوارڈ ادبی نشیمن کے ایڈیٹر کو پیش کیا گیا۔
(بائیں سے) ڈاکٹر بلال نورانی، منوج مشرا، ڈاکٹر آدرش ترپاٹھی، ڈاکٹر سلیم احمد (درمیان میں)
استاد گلشن بھارتی، ڈاکٹر امنگ کھنّہ، عبدالوحید اور قاری امتیاز احمد

Vol: 6, Issue: 02
Mar. to May.2023

Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
Lucknow - 226003

RNI No. UPURDU /2017/74845
Per Copy : 25/-
Biannaul Subscription :300/-

دستاویز

شجاعت، جرأت اور جفاکشی کی بنا پر انگریزوں کا وفادار شیر علی خاں کو پشاور کے انگریزی گھوڑ سوار کیولری میں شامل ہوگیا، شیر علی مضبوط قد کاٹھی کا ایک بہادر جوان تھا



روہیل کھنڈ میں جو خدمات انجام دی اس نے انقلاب 1857 میں اودد اور اس سے انگریزوں کا دل جیت لیا اس بچائی جس سے انگریزوں کی نظر میں اس اسے جنرل ٹیلر نے شیر علی کو اعزازی سند پیش کیا۔ وہ اپنے حسن اخلاق، بہادری افسران میں بہت کم وقت میں مقبول کے قبیلے کی روایت تھی اپنے دشمن کو موقع جائے۔ پشتو قبیلے میں یہ جرم نہیں بلکہ تھا۔ اسی کے تحت شیر علی نے اپنے ایک جرم میں اسے پھانسی کی سزا ہوگئی۔ اسے انگریز افسروں کی جان بچائی ہے اسی ایسا نہیں ہوا ہاں جنرل ٹیلر کی سفارش پر کی سزا میں تبدیل کر دیا گیا یہی وجہ تھی کہ نفرت پیدا ہوگئی اور وہ اس کا انتقام کسی چاہتا تھا۔ کالا پانی کی سزا پانے کے بعد

اپنی حکمت عملی اور منصوبے کے تحت وہ روزہ رکھتا، مزدوری کے پیسوں سے مسکینوں میں کھانا تقسیم کرتا اس کے چال چلن سے وہاں بھی انگریز افسران اس کی خوبیوں سے متاثر ہو گئے اور اسے حجامت بنانے کی اجازت مل گئی اب وہ بلا روک ٹوک جزیرے میں جا سکتا تھا۔ 24 مئی 1872 کو وائسرائے کلکتہ سے برما ہوتے ہوئے پورٹ بلیئر اترے 21 توپوں کی سلامی کے ساتھ استقبال ہوا سخت حفاظتی لاؤلشکر کے ساتھ انھوں نے جزیروں کا جائزہ لیا ماؤنٹ ہیریٹ کے حسین نظارے کے بعد اپنا سفر ختم کرنے کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے ان کے چاروں طرف اعلی افسران اور محافظ دستہ موجود تھا پلک جھپکتے ہی چٹان کے پیچھے سے چیتے کی طرح شیر علی وائسرائے لارڈ میئو کو گرفت میں لے کر سبزی کاٹنے والے چاقو سے اتنا شدید حملہ کیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے یہ ہندوستان کی غلامی کی تاریخ کا بے حد اہم واقعہ ہے جس سے ہم ناواقف ہیں۔

Printed,Published & Prop. By **Ahmad Rashiq at Nomani Press, Baroodkhana,Golaganj, Lucknow**
and Published at 544C/168,Almas bagh,Hardoi Road,Lucknow
Editor: Dr. Saleem Ahmad